کیفیات

(کلیاتِ کیفی اعظمی)

کیفیات

(کلیات کیفی اعظمی)

۱۹۱۸ء تا ۲۰۰۲ء

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ!

Kaifiyaat

(Kulliyat-e-Kaifi Azmi)

Year of Ist Edition 2003
Year of IInd Edition 2012
ISBN 81-87667-78-8

Price: Rs. 350/-

نام کتاب	:	کیفیات (کلیات کیفی اعظمی)
سن اشاعت اول	:	۲۰۰۳ء
سن اشاعت دوم	:	۲۰۱۲ء
قیمت	:	۳۵۰ روپے
تعداد	:	ساڑھے تین سو
مطبع	:	عفیف پرنٹرس، دہلی ۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

ترتیب

- میں اور میری شاعری ---- کیفی اعظمی ---- ۷
- جھنکار ---- ۲۳
- آخرِ شب ---- ۱۳۵
- آوارہ سجدے ---- ۲۶۱
- ابلیس کی مجلس شوریٰ ---- ۳۷۵
- بیانِ صفائی (کیفی اعظمی) ---- ۳۷۹
- پیش لفظ (سردار جعفری) ---- ۳۸۱
- ابلیس کی مجلس شوریٰ ---- ۳۹۱
- ابلیس کی مجلس شوریٰ دوسرا اجلاس ---- ۴۰۱
- متفرقات ---- ۴۰۳

☆☆☆

"کیفیات" کیفی صاحب کی کلیات ہے۔ اسے ان کی زندگی میں شائع ہونا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کا مجھے غم ہے۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ان میں کسی بھی کام یا مقصد کے لیے لوگوں کو منظم کرنے کی کتنی صلاحیت تھی۔ میں نے اپنے بچپن میں انہیں مزدور کسان تحریکوں کی تنظیم کرتے دیکھا ہے۔ میں نے ان کے ہاتھوں اپنے آبائی گاؤں "مجواں" کو جہاں پہلے صرف ٹوٹے ہوئے بے نور گھر، ویرانی، اداسی، مفلسی اور جہالت تھی بیس برس کے عرصے میں ایک ماڈل گاؤں بنتے دیکھا ہے۔ انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (اپٹا) کو ہی لیجیے۔ ابا کے صدر کی حیثیت سے اپٹا نے ملک کے طول و عرض میں تھیٹر عوام کی اس تحریک میں ایک نئی توانائی پیدا کر دی۔ ابا کی پچاسویں سالگرہ بڑی دھوم سے منائی گئی اور جس طرح اس موقع پر حکومت نے ان کے اعزاز میں ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا اس میں اپٹا اور ان کے ساتھیوں کی کاوشوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

ایک طرف تو تھی یہ لگن، یہ جذبہ اور یہ دھن اور دوسری طرف ابا کا کوئی اپنا ذاتی کام ہوتا تو ان کی عدم دلچسپی اور لاپرواہی بھی قابلِ دید تھی۔ تنوی میری بھابھی اور کیفی صاحب کی بہو کہتی ہیں کہ:

"ابا کے بارے میں کوئی سیمینار یا کوئی جلسہ ہو جہاں ابا کی شاعری کی تعریف ہو رہی ہو تجزیہ ہو رہا ہو تو وہاں کیفی صاحب یوں بیٹھے ہوتے تھے جیسے دھیان کہیں اور ہے جیسے یہ ساری تحسین و ستائش ان کی نہیں کسی اور کی ہو رہی ہے جس سے ان کا کوئی واسطہ بھی نہیں ہے۔ غالباً اپنی طرف ان کی یہ لاپرواہی ایک بڑا سبب ہے کہ یہ کلیات پہلے نہیں چھپ سکی۔"

بہر حال اب ''کیفیات'' آپ کے سامنے ہے۔ اس کی اشاعت کے سلسلے میں جن احباب کا خصوصاً شکریہ ادا کرنا چاہوں گی ان میں محترم گوپی چند نارنگ، اے اے فاطمی، ایم۔ ایس حنیف، راجیو سیٹھی، پرمود بھارتی، بھاونا سمیا اور ایس۔ اے رحمان صاحب شامل ہیں۔ مجھے اپنے شریک حیات جاوید اختر کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود پریس میں جانے سے پہلے کلیات کے ایک ایک صفحے کو خود پڑھ کے کتابت کی رہی سہی غلطیوں کی نشان دہی کی اور جہاں تک ممکن تھا اس کتاب کو اغلاط سے پاک کیا۔

مندرجہ بالا اصحاب کے علاوہ میں انتہائی شکر گزار ہوں دنیا کے کونے کونے میں پھیلے کیفی صاحب کے ان گنت پرستاروں اور قدردانوں کی کہ ان کی محبتیں اور شوق اس کتاب کی اشاعت کا ایک بڑا جواز ہیں۔

شبانہ اعظمی
(ممبئی)

۲۸؍اپریل ۲۰۰۳ء

☆☆

میں اور میری شاعری

اپنے بارے میں یقین کے ساتھ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں غلام ہندوستان میں پیدا ہوا، آزاد ہندوستان میں بوڑھا ہوا اور سوشلسٹ ہندوستان میں مروں گا۔ یہ کسی مجذوب کی بڑ یا دیوانے کا خواب نہیں ہے۔ سوشلزم کے لئے ساری دنیا میں اور خود میرے اپنے ملک میں ایک مدت سے جو عظیم جدوجہد ہو رہی ہے اس سے ہمیشہ جو میرا اور میری شاعری کا تعلق رہا ہے اس یقین نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

میں اتر پردیش کے ایک مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں میں پیدا ہوا۔ گھر پر کاشتکاری بھی ہوتی تھی چھوٹی موٹی زمینداری بھی تھی۔ میرے والد سید فتح حسین رضوی مرحوم کو قدرت نے ایک ایسی نگاہ عطا کی تھی جو پتھر کے سینے میں تانِ آذری کا رقص دیکھ لیا کرتی تھی۔ آج سے ۸۰، ۹۰ برس اُدھر جب میرے سب سے بڑے بھائی پیدا ہوئے تو ابا نے اماں سے کہا ہندوستان میں زمینداری کا کوئی مستقبل نہیں ہے، اگر ہم اس پر تکیہ کئے بیٹھے رہے تو نہ بچوں کی تعلیم ہو سکے گی نہ تربیت اس لئے میں گاؤں سے نکل کر باہر جاتا ہوں۔ اگر کوئی ڈھنگ کی ملازمت مل گئی تو آپ کو بھی وہیں بلاؤں گا اور جہاں تک ممکن ہوگا بچوں کو لکھنؤ میں رکھوں گا تاکہ وہاں ان کی مناسب تعلیم ہو سکے اور زبان بھی نکھر جائے۔ ابا کے اس فیصلے سے خاندان میں کہرام مچ گیا کہ کتنا غلط اقدام ہے۔ اگر اپنا راج پاٹ چھوڑ کے انھوں نے نوکری کر لی تو پورے زمینداروں کی

ناک کٹ جائے گی۔ ابا نوکری کا فیصلہ اس لئے کر سکے کہ اس وقت سارے خاندان میں تنہا وہی تعلیم یافتہ تھے۔ خاندان کی چیخ و پکار پر کان دھرے بغیر ابا لکھنؤ چلے گئے۔ خوش قسمتی سے ان کو بہت جلدی اودھ کی ایک مشہور ریاست بلہرہ میں تحصیل داری مل گئی۔ اس کے بعد ابا نے بیوی بچوں کو بھی وہیں بلالیا اور لکھنؤ میں ایک مکان کرایے پر لے کے لڑکوں کو وہاں رکھا۔ کچھ دنوں کے بعد بڑے بھائی پڑھنے کے لئے علی گڑھ بھیج دیے گئے ان کے بعد کے دو بھائی لکھنؤ میں رہے۔ ان کی تعلیم وہیں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک لیکن ابا نے گاؤں سے رشتہ توڑا نہیں اپنے چھوٹے بھائیوں کو روپے بھیجتے رہے۔ کاشتکاری جو پہلے سے ہوتی تھی اس نے اس زمانے میں بہت ترقی کی۔ ابا نے گاؤں میں گھر بنوایا جس کو گاؤں کے عام گھروں کے مقابلے میں حویلی کہہ سکتے ہیں۔ زمیندار ہونے کے باوجود ابا کو اپنی بیٹیوں سے زیادہ پیار تھا لیکن بدقسمتی سے سب سے بڑی باجی کو دق ہوگئی۔ اس وقت دق نزلے زکام سے زیادہ نہیں لیکن اس وقت یہ بیماری کینسر سے کم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ابا نے باجی کا اچھے سے اچھا علاج کرایا تھا ان کو لے کر اس ڈاکٹر کے پاس سے اس ڈاکٹر کے پاس اس اسپتال سے اس اسپتال اس شہر سے اس شہر جاتی رہیں لیکن الٹی ہوگئیں کل تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ تین چار سال بیمار رہ کے باجی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد تین اور بہنیں یکے بعد دیگرے اسی موذی مرض کا شکار ہوئیں ان کا بھی اسی طرح علاج ہوا۔ میں اس وقت گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ اماں جہاں اپنی کسی بیٹی کو لے کے علاج کے لئے جاتیں مجھے ان کے ساتھ جانا پڑتا اس طرح میں نے اس کچی عمر میں اپنے چاروں طرف بیماریوں اور دکھوں کا ہجوم دیکھا اور میں دھیرے دھیرے غم پسند ہوتا گیا۔ بدقسمتی سے ان بہنوں کا بھی انتقال ہوگیا۔ چار چار جوان بیٹیوں کی موت سے ابا ہر اعتبار سے بہت کمزور ہوگئے۔ وہ یہ سوچنے اور کہنے لگے کہ ہم نے اپنے سب لڑکوں کو انگریزی پڑھائی ہے، اس لئے گھر پر یہ ادبار نازل ہوا ہے۔ وہ اماں سے اکثر کہتے کہ جب ہم مریں گے تو کوئی بیٹا فاتحہ بھی نہ پڑھے گا انگریزی اسکولوں میں ان کو فاتحہ پڑھنا سکھایا ہی نہیں گیا ہے اس لئے والدین نے

اپنے طور پر یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے مذہبی تعلیم دلائی جائے۔ اس بات کو نئی نسل کی ایک ترقی پسند افسانہ نگار عائشہ صدیقی نے میرے بارے میں ایک مضمون میں اس طرح لکھا ہے کہ "کیفی صاحب کو ان کے بزرگوں نے ایک دینی درس گاہ میں اس غرض سے داخل کیا تھا کہ وہاں یہ فاتحہ پڑھنا سیکھ جائیں گے۔ کیفی صاحب اس درس گاہ میں مذہب پر فاتحہ پڑھ کے نکل آئے"۔ اس درس گاہ کی بات یہ ہے کہ والدین نے مجھے مولوی بنانے کے خیال سے میرے لئے انگریزی کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا۔ چچا مرحوم جو کاشتکاری سنبھالتے تھے وہ مجھے کچھ بھی پڑھانے کے خلاف تھے۔ وہ ابا سے ہمیشہ کہتے کہ آپ نے جن لڑکوں کو صاحب بہادر بنادیا ہے وہ تو نہ کبھی گاؤں میں رہیں گے نہ کھیت کھلیان کے چکر میں پڑیں گے۔ میں اب کتنے دن جیوں گا اور کتنے دن اتنی بڑی کھیتی کو سنبھالوں گا۔ ایک لڑکے کو تو اس قابل رہنے دیجئے کہ وہ ان چیزوں کو سنبھال سکے۔ لیکن میرا یہ حال تھا کہ بھائی صاحبان جب چھٹیاں گذار کے لکھنؤ جانے لگتے تو میں گھر کے کسی کونے میں رو رو کے اپنا برا حال کرلیتا۔ ان حالات میں عمر کا وہ حصہ جس میں تعلیم شروع ہو جانا چاہئے تھی ضائع ہوگیا۔ لیکن اچانک قسمت نے یاوری کی۔ فصل کی کٹائی ہو رہی تھی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ منھ اندھیرے کسان اپنے ہنسیا لے کے آجاتے ہیں اور دوپہر تک بڑے سے بڑا کھیت صاف ہو جاتا ہے۔ اس کا معاوضہ ان کو یہ ملتا ہے کہ وہ جو چیز کاٹتے ہیں اس کی چھوٹی چھوٹی پولیاں بنا کے کھیت میں ایک قطار سے بچھا دیتے ہیں۔ بیس پولیاں زمیندار کی ہوتی ہیں اکیسویں اس کسان کی جو فصل کاٹتا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا کھیت جس میں گلے گلے جو آیا تھا وہ کٹ رہا تھا۔ اتفاق سے چچا کو تحصیل جانا تھا۔ وہ جاتے جاتے مجھے کھیت میں بٹھا گئے اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ دھیان رکھنا یہ لوگ بڑے بے ایمان ہوتے ہیں اور حرام خور بھی یہ اکیسویں پولی ہمیشہ بہت بڑی بناتے ہیں۔ ایک ایک پولی میں دو دو تین تین پسیری اناج وہ لے کے چلے جاتے ہیں۔ کسی کو ایسا نہ کرنے دینا خبردار۔ میں نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ میں ایک بال کسی کو زیادہ نہ لے جانے دوں گا۔ مطمئن ہو کے چچا تحصیل چلے گئے۔ فصل کٹتی رہی میں نگرانی کرتا رہا۔

گاؤں کی ایک خوبصورت اور جوان لڑکی بھی فصل کاٹ رہی تھی میں زیادہ تر اسی کے قریب کھڑا رہا۔ دوپہر تک اس کے گورے گورے گالوں سے دھوپ رنگ بن کے ٹپکنے لگی۔ اس کو کچھ اپنے اوپر اعتماد تھا کچھ میری کمزوری بھی وہ سمجھ چکی تھی اس لئے اس نے پولیاں بہت بڑی بنا رکھی تھی اور جب میں ان کو دیکھنے لگتا تو وہ مسکرانے لگتی۔ اس نے پولیاں جیسی بنائی تھیں ایسی ہی میں نے اس کو لے جانے دیں۔ گاؤں کی ایک بوڑھی عورت یہ سب کچھ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تھوڑا سا اناج چرا رکھا تھا۔ اتنے میں چچا آ گئے انھوں نے اس بوڑھیا کو پکڑ لیا اس کو ذرا یا دھمکایا تو اُس نے اُن سے نمک مرچ لگا کے میری شکایت جڑ دی کہ توں اسے مٹھی بھر جو چھین لیے اور تیرے ہوائے لوکا، اُو جون چڑیا کی طرح بال ڈارے آئی رہی، تیرے ہوائے لوکا اُو جون چڑیا کی طرح سنگار کر کے کالے آئی رہی بوجھ کا بوجھ اٹھائے کے او کے سر اپر رکھ دیں۔ چچا نے میرا کان پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے گھر میں اماں کے پاس لے گئے کہ ان کو بھی وہیں بھیج دیجئے، یہ گاؤں میں رہیں گے تو سب کچھ لٹا دیں گے۔ مجھے مانگی مراد مل گئی، دو چار دن کے بعد اماں نے ماموں کے ساتھ مجھے لکھنؤ بھیج دیا۔

لکھنؤ میں شیعوں کی سب سے بڑی درس گاہ سلطان المدارس میں میرا نام لکھا دیا گیا اور بورڈنگ میں داخل کر دیا گیا۔ اس دینی درس گاہ میں پہونچ کے اور بورڈنگ میں رہ کے مجھ پر عرفی کے ایک شعر کی صداقت پوری طرح ظاہر ہوئی۔

مفتیاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آن کار دیگر می کنند

میں دیکھتا تھا کہ روز جب انٹرول ہوتا ہے مولانا جو ہمیں پڑھاتے تھے ہمارے درجے کے ایک لڑکے کو جس کے خط و خال دل کش تھے اپنے ساتھ لے کے اپنے کمرے میں چلے جاتے اور اندر سے دروازہ بند ہو جاتا۔ میں نیا نیا گاؤں سے آیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں تجسس زیادہ ہوتا ہے۔ میرے دل میں بھی کرید پیدا ہوئی کہ دیکھوں کمرے میں

ہوتا کیا ہے۔ روشندان جو ذرا بلندی پر تھا میں نے اس کے نیچے ایک اسٹول رکھا اور اس پر کھڑے ہو کے روشندان سے کمرے میں جھانکنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے مولوی صاحب پلنگ پر دراز ہیں دو تین مولوی صاحبان پلنگ کے قریب کرسیوں پر بیٹھے ہیں لڑکا ہمارے مولوی صاحب کے پلنگ پر بیٹھا ایک چھوٹی سی کتاب پڑھ کے اُن کو سنا رہا ہے تھوڑے تھوڑے وقفے سے مولوی صاحب کہتے لاحول ولاقوۃ اور لڑکے کے گال میں زور سے چٹکی لیتے، باری باری دوسرے مولوی صاحبان بھی یہی حرکت کرتے۔ اس وقت شیعہ مولوی صاحبان اور مولانا عبدالشکور میں بڑے مناظرے ہو رہے تھے میں سمجھا اسی سلسلے کی یہ کوئی کتاب ہوگی ہمارے مولوی صاحب جس کا منہ توڑ جواب لکھیں گے شاید۔

جب کمرہ کھلا اور لڑکا باہر نکلا تو میں نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے طرح طرح سے پوچھنا شروع کیا کہ تم کیا پڑھ کے سناتے ہو۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا اور مجھے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے بھاگ کے کمرے میں گیا اور کتاب لا کے مجھے دکھائی۔ یہ مختصر افسانوں کا ایک مختصر سا مجموعہ انگارے تھا جس پر یوپی سرکار نے پابندی لگا رکھی تھی۔ ترقی پسند ادب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

سلطان المدارس جس دن قائم ہوا تھا اسی دن اس کے سارے قاعدے قانون بن گئے تھے۔ اس میں حالات کے مطابق پھر کسی ترمیم و تنسیخ کو حرام سمجھا گیا تھا۔ میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر طالب علموں کی ایک انجمن بنائی اور انجمن کی طرف سے طالب علموں کے کچھ مطالبے مرتب کر کے سلطان المدارس کے ارباب حل وعقد کے سامنے پیش کئے۔ اس کا جواب ہم کو یہ ملا کہ یہ انجمن ہماری مخالفت میں بنائی گئی ہے ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے انجمن کو فوراً توڑ دو ورنہ ۔۔۔۔ انجمن بن چکی تھی، اس کو توڑنے کا تو کوئی سوال تھا ہی نہیں۔ ہم نے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو نوٹس دیا کہ اگر فوراً ہماری انجمن کو تسلیم نہ کیا گیا تو ہم اسٹرائیک کر دیں گے اور ہوا یہی کہ ہم کو کچھ ہی دنوں کے بعد اسٹرائیک کرنا پڑی۔ اسٹرائیک میں تمام طالب علم شریک ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد دفتر کا عملہ اور

دیکھا استاد بھی ہمارے ساتھ آ گئے۔ اسٹرائیک کی اس وسعت سے ارباب اقتدار بوکھلا گئے۔ انھوں نے نوٹس دیا کہ سلطان المدارس بند کیا جاتا ہے اور بورڈنگ بھی بند کیا جاتا ہے۔ تم لوگ کمرے چھوڑ دو اور اپنے اپنے گاؤں چلے جاؤ جب سلطان المدارس کھلے گا تم لوگ بلالئے جاؤ گے۔ ہم لوگوں نے اس نوٹس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ کمروں میں بھی ڈٹے رہے اور اپنے مطالبات پر بھی ڈٹے رہے۔ ایک رات حسین آباد کے کارندے موٹے موٹے ڈنڈے لے کے آئے۔ انھوں نے ہمارا سامان کمروں سے نکال نکال کے باہر پھینک دیا اور ہماری اچھی خاصی پٹائی بھی کی۔ ہم بھی اہنساوادی نہیں تھے ہم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور بورڈنگ پر قبضہ کئے بیٹھے رہے۔ اس وقت تک میری شاعری شروع ہو چکی تھی۔ شاعری کی ابتدا ایک روایتی غزل سے ہوئی تھی لیکن اس اسٹرائیک کے دوران غزل گوئی چھوٹ گئی اور میں احتجاجی شاعری کرنے لگا۔ قریب قریب روز ایک نظم کہہ لیتا لڑکوں کو سناتا اور ان میں جوش پیدا کرتا۔ پٹائی کے بعد دوسرے دن سلطان المدارس کے شمالی پھاٹک پر میٹنگ ہو رہی تھی۔ لڑکے کچھ زمین پر بیٹھے تھے کچھ کھڑے تھے میں ان کے درمیان کھڑا ایک نظم سنا رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک نہایت وجیہ بزرگ تانگے پر بیٹھے ہماری طرف آرہے ہیں۔ میں گھبرایا کہ یہ حضرت آکے ابھی ہم کو سمجھانا شروع کریں گے کہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو اس سے ہمارا اتنا بڑا تعلیمی ادارہ بند ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ گھبراہٹ میں وہ نظم میں اور جوش سے پڑھنے لگا۔ قریب آکے وہ بزرگ تانگے سے اتر پڑے اور میٹنگ میں شامل ہو گئے۔ نظم ختم ہوئی تو انھوں نے مجھ سے نظم مانگی۔ میں نے دے دی ایک سرسری نظر ڈال کے انھوں نے نظم جیب میں رکھ لی اور مجھ سے کہا تم اور تم جن کو چاہو اپنے ساتھ لے لو اور میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں نے گنواروں کی طرح پوچھ لیا کہ آپ ہیں کون بزرگ؟ انھوں نے فرمایا مجھے علی عباس حسینی کہتے ہیں۔ علی عباس حسینی اردو والوں میں پریم چند کے بعد دوسرا بڑا نام تھا۔ میں سر جھکا کے ان کے پیچھے ہولیا۔ وہ گولہ گنج میں رہتے تھے۔ گھر پہونچ کے حسینی صاحب نے نوکر کو چائے بنانے کا حکم دیا اور اپنے صاحبزادے سے کہا جاؤ دیکھو

احتشام صاحب یونیورسٹی سے آگئے ہوں تو بلا لاؤ۔ احتشام صاحب قریب ہی بارود خانے میں رہتے تھے۔ احتشام آئے تو ان کے ساتھ اعظم حسین صاحب بھی آگئے جو روزنامہ سرفراز کے اڈیٹر تھے۔ حسینی صاحب نے نہایت زوردار لفظوں میں ہماری وکالت کی اور مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنی وہی نظم سناؤں۔ میں نے نظم سنائی۔ نظم اعظم صاحب نے لے لی کہ وہ اس کو سرفراز میں شائع کریں گے اور ہماری حمایت میں اداریہ بھی لکھیں گے۔ احتشام صاحب مجھے آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے دفتر لے گئے۔ وہاں انھوں نے مجھے علی سردار جعفری صاحب سے ملایا۔ یہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری تھے یا صدر۔ اعظم صاحب نے ہماری تائید میں زبردست اداریہ لکھا، جعفری صاحب ہماری میٹنگوں میں آنے لگے۔ اب ہمارے ایجی ٹیشن میں توانائی پیدا ہو گئی۔ حسین آباد وقف کے متولیوں نے ہماری مانگیں مان لیں اور تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ہماری اسٹرائیک ختم ہوئی لیکن میں اور میرے چند اور ساتھی سلطان المدارس سے نکال دیے گئے۔ مولوی بننے کا خیال تو میں ترک کر ہی چکا تھا لیکن تعلیم جاری رکھی اور پرائیویٹ امتحانات دے کے اردو، فارسی اور عربی کی چند اسناد حاصل کیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ دبیر ماہر (فارسی)
۲۔ دبیر کامل (فارسی) — لکھنؤ یونیورسٹی
۳۔ عالم (عربی)

۴۔ اعلیٰ قابل (اردو)
۵۔ منشی (فارسی) — الہ آباد یونیورسٹی
۶۔ منشی کامل (فارسی)

سوچا یہ تھا کہ یہ امتحانات پاس کر کے کسی کالج میں براہ راست ایف۔ اے میں داخلہ لے لوں گا اور انگریزی پڑھوں گا لیکن جب تک سیاست اور شاعری دونوں کا جنوں بہت ترقی

کر چکا تھا۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے جس نظم وضبط کی ضرورت تھی میرا لاابالی پن اس کو جھیل نہیں سکا اور تعلیم ادھوری رہ گئی۔

شاعری تو ایک طرح سے مجھے ورثے میں ملی تھی۔ میرے والد باقاعدہ شاعر تو نہیں تھے لیکن ان کا شاعری کا ذوق بہت بلند تھا۔ گھر میں اردو، فارسی کے دیوان بڑی تعداد میں تھے۔ میں نے یہ کتابیں اس عمر میں پڑھیں جب ان کا بہت کم حصہ سمجھ میں آتا تھا۔ مجھ سے بڑے تینوں بھائی باقاعدہ شاعر تھے یعنی صاحب بیاض بھی تھے اور صاحب تخلص بھی۔ سب سے بڑے بھائی سید ظفر حسین مرحوم کا تخلص مجروح تھا۔ ان سے چھوٹے بھائی سید یوسف حسین کا تخلص بیتاب تھا۔ ان سے چھوٹے بھائی سید شبیر حسین کا تخلص وفا تھا۔

بھائی صاحبان جب چھٹیوں میں علی گڑھ اور لکھنؤ سے گھر آتے تھے تو گھر پر اکثر شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں بھائی صاحبان کے علاوہ قرب وجوار کے شعراء شریک ہوتے۔ بھائی صاحبان جب ابا کو اپنا تازہ کلام سناتے اور ابا سے داد پاتے تو مجھے بہت رشک ہوتا اور میں بڑی حسرت سے اپنے سے سوال کرتا کیا میں بھی کبھی شعر کہہ سکوں گا لیکن میں جب بھائیوں کے شعر سننے کے لئے کھڑا ہو جاتا یا چپ چاپ کہیں بیٹھ جاتا تو فوراً کسی بزرگ کی ڈانٹ پڑتی کہ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا گھر میں جاؤ اور پان بنوا کے لاؤ۔ میں زمین پر پاؤں پٹکتا تقریباً روتا ہوا گھر میں باجی کے پاس جاتا کہ دیکھئے میرے ساتھ یہ ہوا میں ایک دن ان سب سے بڑا شاعر بن کے دکھاؤں گا۔ باجی مسکرا کے کہتیں کیوں نہیں تم ضرور کبھی بڑے شاعر ہو گے ابھی تو یہ پان لے جاؤ اور باہر دے آؤ۔ اسی عمر میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ابا بہرائچ میں تھے۔ قزلباش اسٹیٹ کے مختار عام یا پتہ نہیں کیا۔ وہاں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس وقت زیادہ تر مشاعرے طرحی ہوا کرتے تھے اسی طرح کا ایک مشاعرہ تھا۔ بھائی صاحبان لکھنؤ سے آئے تھے۔ بہرائچ، گونڈہ، نانپارہ اور قریب و دور کے بہت سے شعراء مدعو تھے۔ مشاعرے کے صدر مانی جائسی صاحب تھے۔ ان کے شعر سننے کا ایک خاص طریقہ تھا کہ وہ شعر سننے کے لئے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھ جاتے اور اپنا سر

اپنے دونوں گھٹنوں میں دبا لیتے اور جھوم جھوم کے شعر سنتے اور داد دیتے۔ اس وقت شعراء حسب مراتب بٹھائے جاتے۔ ایک چھوٹی سی چوکی پر قیمتی قالین بچھا ہوتا اور گاؤ تکیہ لگا ہوتا۔ صدر اسی چوکی پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتا۔ جس شاعر کی باری آتی وہ اسی چوکی پر آ کے ایک طرف نہایت ادب سے دوزانو ہو کے بیٹھتا۔ مجھے موقع ملا تو میں بھی اسی طرح ادب سے چوکی پر ایک کونے میں دوزانو بیٹھ کے اپنی غزل جو طرح میں تھی سنانے لگا۔ طرح تھی مہرباں ہوتا رازداں ہوتا وغیرہ۔ میں نے ایک شعر پڑھا

وہ سب کی سن رہے ہیں سب کو داد شوق دیتے ہیں
کہیں ایسے میں میرا قصۂ غم بھی بیاں ہوتا

مانی صاحب کو نہ جانے شعر اتنا کیوں پسند آیا کہ انھوں نے خوش ہو کے پیٹھ ٹھونکنے کے لئے پیٹھ پر ایک ہاتھ مارا تو میں چوکی سے زمین پر آ رہا۔ مانی صاحب کا منہ گھٹنوں میں چھپا ہوا تھا اس لئے انھوں نے دیکھا نہیں کہ کیا ہوا۔ جھوم جھوم کے داد دیتے اور شعر مکرر مکرر مجھ سے پڑھواتے رہے اور میں زمین پر پڑا پڑا شعر دوہراتا رہا۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں شاعر کی حیثیت سے میں شریک ہوا۔ اس مشاعرے میں مجھے جتنی داد ملی اس کی یاد سے اب تک فرحت ہوتی ہے۔ بزرگوں نے اس طرح میرا دل بڑھایا کہ واہ میاں ماشاء اللہ آپ کا حافظہ بہت اچھا ہے، کسی نے کہا زندہ رہو میاں کس اعتماد سے غزل سنائی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھ رہا اور کسی نہ کسی طرح ظاہر کر رہا تھا کہ مجھے میرے کسی بھائی نے غزل لکھ کے دے دی ہے جو میں نے اپنے نام سے پڑھی ہے۔ خیر ان بزرگوں کی ان خوش فہمیوں کی میں نے زیادہ پروا نہیں کی لیکن جب ابا نے بھی کوئی اسی طرح کی بات کی تو میرا دل ٹوٹ گیا اور میں رونے لگا۔ میرے بڑے بھائی شبیر حسین وفا، ابا بیٹوں میں جن کو سب سے زیادہ چاہتے تھے انھوں نے ابا سے کہا، انھوں نے جو غزل پڑھی ہے وہ انھیں کی ہے شک دور کرنے کے لئے کیوں نہ ان کا امتحان لے لیا جائے۔ اس وقت ابا کے منشی حضرت شوق بہرائچی تھے جو مزاحیہ شاعر تھے۔ انھوں نے اس تجویز کی تائید کی۔ مجھ سے پوچھا کیا امتحان دینے کے لئے

تیار ہو۔ میں خوشی سے اس کے لئے تیار ہو گیا۔ شوق صاحب نے مصرعہ دیا "اتنا خوشی کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے" بھائی صاحب نے کہا ان کے لئے یہ زمین بنجر ثابت ہو گی کوئی شگفتہ سی تجویز کیجئے لیکن میرا اس وقت کا اکو آج جسے اکثر تلاش کرتا ہوں میں نے کہا اگر میں غزل کہوں گا تو اسی زمین میں ورنہ امتحان نہیں دوں گا۔ طے پایا کہ اسی طرح میں طبع آزمائی کروں۔ میں اسی جگہ لوگوں سے ذرا الگ ہو کے دیوار کی طرف منھ کر کے بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر میں تین چار شعر ہو گئے۔ آج ان شعروں کو دیکھتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں میرا کیا ہے پوری غزل میں وہی باتیں تھیں جو اساتذہ کہہ چکے تھے۔ اس زمانے کا زیادہ کلام ضائع ہو گیا لیکن وہ پہلی غزل اس لئے زندہ رہ گئی کہ نہ جانے کہاں سے وہ بیگم اختر تک پہونچ گئی۔ اس میں انھوں نے اپنی آواز کے پنکھ لگا دیے اور سارے ہندوستان، پاکستان میں مشہور ہو گئی۔ لیجئے وہ غزل آپ بھی سن لیجئے۔ یہ میری زندگی کی پہلی غزل ہے جو میں نے گیارہ برس کی عمر میں کہی تھی۔

غزل

اتنا تو زندگی میں کسی کے خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے
ساقی سبھی کو ہے غم تشنہ لبی مگر
مے ہے اسی کی نام پہ جس کے ابل پڑے
مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

اب اس غزل کو آپ پسند کریں یا نہ کریں خود میں بھی اب ایسی غزل نہیں کہہ سکتا لیکن اس کی یہ افادیت ضرور ہے کہ اس نے لوگوں کا شک دور کر دیا اور سب نے یہ مان لیا کہ میں نے جو کچھ اپنے نام سے مشاعرے میں سنایا تھا وہ میرا ہی کہا ہوا تھا مانگے کا اجالا نہیں تھا۔ بہرائچ میں یہ غزل کہنے اور مشاعرے میں سنانے کے بعد جب لکھنؤ آیا تو سب نے یہ سمجھایا کہ اگر سنجیدگی سے شاعری کرنا چاہتے ہو تو کسی استاد کا دامن پکڑ لو کوئی بے استاد شاعر نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے گونڈے بہرائچ میں ہو جائے لیکن یہ لکھنؤ ہے۔ اس زمانے میں وہاں دو استادوں کا سکہ چل رہا تھا حضرت آرزو لکھنوی اور مولانا صفی۔ میں آرزو صاحب کے مقابلے میں صفی صاحب کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ ہمت کر کے ان کے دولت خانے پر پہونچ گیا۔ وہ مولوی گنج میں رہتے تھے۔ میں نے اطلاع بھجوائی۔ صفی صاحب کا بڑا پن ملاحظہ فرمایئے کہ انھوں نے بلا لیا۔ وہ ایک کھری چارپائی پر لنگی باندھے اور بنیائن پہنے بیٹھے تھے۔ میں پہونچا تو سر اٹھا کے میری طرف دیکھا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا میں آپ سے اصلاح لینا چاہتا ہوں۔ انھوں نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا کچھ کہا ہے؟ میں نے یہی غزل سنائی۔ مولانا صفی نے ایک شعر پر سر ہلایا اور ایک شعر مکرر پڑھوایا اور داد دی۔ ظاہر ہے کہ میرے لئے یہ بہت تھا۔ پھر انھوں نے پوچھا تمھاری عمر کیا ہے۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کے اپنا قد اونچا کر کے کہا ۱۱ برس۔ یہ سن کے وہ مسکرائے۔ انھوں نے کہا میری شاعری کی عمر اس وقت ۶۵ برس کی ہے اگر تمھارے کلام میں زبان اور بیان کی کوئی خامی ہو تو میں اسے ضرور ٹھیک کر سکتا ہوں لیکن ایسا کرنے میں تمھاری فکری گرمی بھی نکل جائے گی۔ ۱۱ برس کے سینے میں جو حدت ہوتی ہے وہ ۶۵ برس کے سینے میں نہیں ہو سکتی۔ تم ایک خاص عقیدت سے میرے پاس اصلاح کے لئے آئے ہو لیکن اصلاح کے بعد جب جاؤ گے تو کڑھتے ہوئے جاؤ گے کہ میری غزل خراب کر دی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر [illegible] مگر وہ نہ ہو تو کہتے رہو اور پڑھتے رہو شعر کی خامیاں خشک پتوں کی طرح گرتی جائیں گی اور

خوبیاں نئی کونپلوں کی طرح پھوٹتی رہیں گی۔ اسی مشورے کی روشنی میں میں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا جو ابھی تک جاری ہے اب تک میری نظموں اور غزلوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ جھنکار

۲۔ آخرِ شب

۳۔ آوارہ سجدے

۴۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ (دوسرا اجلاس)

۵۔ سرمایہ

آوارہ سجدے کی پذیرائی مختلف حلقوں میں مختلف ڈھنگ سے ہوئی۔ دلّی میں کوئی انور دہلوی صاحب ہیں انھوں نے اور شاہی امام نے آوارہ سجدے کے خلاف جہاد چھیڑ دیا۔ کتاب ضبط کرنے اور مجھے جیل میں ڈالنے کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ رہبرِ دکن اور سیاستِ جدید کانپور نے بھی اپنی تن بھی کا بے شرمی کے ساتھ مظاہرہ کیا۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے اس کو اس سال کی سب سے بہتر کتاب گردانا اور اپنا پہلا اوارڈ دیا۔ اسی کتاب پر مجھے سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ بھی ملا۔ آوارہ سجدے پر مجھے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ بھی ملا جو میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہے۔ مہاراشٹر اردو اکادمی نے بھی ایک خصوصی ایوارڈ دیا۔ میری مجموعی ادبی خدمات پر مجھے لوٹس ایوارڈ بھی ملا۔ یہ ایوارڈ افرو ایشین رائٹرز کمیٹی کی بین الاقوامی جیوری دیتی ہے۔ میں نے اب تک یہ احتیاط کی تھی کہ جو نظم کسی ایک کتاب میں آجائے وہ دوسرے مجموعے میں شامل نہ کی جائے۔ اس سے یہ نقصان ہوا کہ بعض اہم نظمیں اہلِ نظر تک نہیں پہونچ سکیں اس لئے سرمایہ میں جھنکار، آخرِ شب اور آوارہ سجدے کی زیادہ تر نظمیں جمع کر دی گئی ہیں لیکن یہ کلیات نہیں ہے۔ میں نے شاعری کیوں شروع کی شاعر کیسے بنا (اگر مجھے شاعر سمجھتے ہیں) اس کی تحقیق کے لئے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ میں نے جس گھر میں جنم لیا اس میں شاعری

رچی بسی ہوئی تھی لیکن سیاست سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی اس کو سمجھنا اور سمجھانا میرے لئے بھی مشکل ہے۔ میں جس گاؤں میں پیدا ہوا اور ابتدائی زندگی جہاں گذری وہاں باہر کی ہوا بھی مشکل سے آتی تھی۔ شہروں میں کیا ہو رہا ہے، کانگریس کیا کر رہی ہے، مسلم لیگ کیا کر رہی ہے اس کا ذکر بھی وہاں نہیں آتا تھا۔ بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے نیل کی کاشت شروع کروائی تو ہمارے گاؤں میں نیل کے بیج آئے اور کارندوں کی زبانی پیغام بھی آیا کہ جو گیہوں بو؟ چھوڑ دو نیل کی کھیتی شروع کرو تو کمپنی بہادر تم کو مالا مال کر دے گی۔ میرے دادا مرحوم نے جب یہ سنا تو انھوں نے رازدارانہ طور پر گاؤں والوں کو سمجھایا کہ دیکھو کمپنی ہمارے کاریگروں کے انگوٹھے کاٹ کر ہماری صنعت اور تجارت کو ٹھکانے لگا چکی ہے اب کھیتی باڑی کو بھی تباہ کرنا چاہتی ہے اس لئے چپکے چپکے ان بیجوں کو بونے سے پہلے بھون ڈالو بھنے ہوئے بیج اُگ نہیں سکتے اور جب وہ اُگیں گے نہیں تو کمپنی یہ سمجھے گی کہ اس گاؤں کی زمین نیل کی کھیتی کے لئے مناسب نہیں اور ہم کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ دادا مرحوم نے خود بھی کیا اور ان کے مشورے پر کچھ اور لوگوں نے ایسا ہی کیا جب نیل کے بیج اُگے نہیں تو کمپنی یہ سمجھنے پر مجبور ہوئی کہ اس گاؤں کی زمین اچھی نہیں ہے لیکن کچھ دنوں میں یہ بات سب کو معلوم ہو گئی کہ کسانوں نے نیل کے بیج میر عطا حسین کے کہنے پر بھون ڈالے تھے۔ دادا مرحوم پر مقدمہ چلا جائداد ضبط ہوئی لیکن اس کے بعد کمپنی نے ہمارے گاؤں کے لوگوں کو نیل بونے پر مجبور نہیں کیا۔ دادا مرحوم نے کمپنی کے خلاف نفرت کا جو بیج نیل کے کھیتوں میں بویا تھا وہ ایک دن میرے سینے میں پھوٹا اور پھولا پھلا۔ میری عمر کوئی ۹۔۱۰ برس کی ہوگی جب میں نے سنا کہ ہماری تحصیل میں ایک گورا کلکٹر آرہا ہے جس نے اعظم گڑھ کے زمینداروں کو بہت ستایا ہے جو ہندوستانیوں سے بہت نفرت کرتا ہے۔ میں نے اپنی ہی عمر کے لڑکوں کو جمع کیا، بہنوں کے کالے دوپٹے چرا کے پھاڑے اور کالے جھنڈے بنائے اور چوری چوری تحصیل پہونچ گئے کہ جب وہ بندر آئے گا تو ہم اس کو کالے جھنڈے دکھائیں گے۔ کلکٹر بہت دیر میں آیا۔ تھانے دار جو اس کے پاس

اکثر آتا تھا اس نے ہم کو دیکھ لیا اور مجھے پکڑ کے ابا کے پاس لایا۔ ابا کسی غیر کے سامنے ہم کو کبھی نہ ڈانٹتے تھے نہ مارتے تھے لیکن انھوں نے ہم کو سمجھایا بہت کہ اب ایسا نہ کرنا۔ انھیں دنوں کی بات ہے کہ جنگل میں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے میں نے دیکھا کہ ایک ببول کے درخت میں کہیں سے ایک جنگلی روئی اُڑ کے آئی اور کانٹوں میں پھنس گئی ہے۔ میں نے انگلیوں کو کانٹوں سے بچاتے ہوئے وہ روئی نکال لی اب میں اور میرے ساتھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہے ہیں اور سوچ رہے تھے کہ ببول میں روئی کہاں سے آ گئی۔ کچھ دور پر آم کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے ہمارے گاؤں کا ایک بزرگ آدمی زمین پر کمبل بچھائے لیٹا سو رہا تھا۔ میں روئی لئے اس کے پاس پہونچا اور روئی دکھا کے اس سے پوچھا کہ چاچا ببول کے پیڑ میں روئی کہاں سے آ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اُس نے ہم کو سمجھایا کہ بابو جب سے مہاتما گاندھی نے چرخہ کاتنا شروع کیا ہے بھگوان ہر جگہ روئی پیدا کرنے لگا ہے۔ میں سر کھجانے اور سوچنے لگا کہ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ گاندھی جی چرخہ کاتتے ہیں۔ اس وقت کا ہندوستان ایسا ہی ماحول تھا لیکن میرے گھر پر سیاست کا سایہ نہیں پڑا۔ ایک بات جس پر مجھے فخر ہے اور جو قابل ذکر بھی ہے کہ میرے گھر پر کبھی فرقہ پرستی کا بھوت نہیں منڈلایا۔ بھائی صاحبان جب چھٹیوں میں آتے تو ان کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کی خبریں بھی آتیں۔ کبھی کھانے پر یا چائے پر گاندھی جی اور ان کی بکری کی بات چھڑتی یا یہ کہانی کہ جواہر لال نہرو کے کپڑے پیرس سے دھل کے آتے ہیں۔ مجھے ان باتوں میں دلچسپی تو بہت تھی لیکن کوئی روشنی نہیں ملتی تھی۔ جب لکھنؤ آیا وہاں سوراج کا اندولن بہت زوروں پر چل رہا تھا۔ میں پربھات پھیریوں میں شامل ہو گیا۔ منھ اندھیرے کی پربھات پھیری میں میں شامل ہوتا اور نظمیں پڑھتا۔ اس مجموعے میں جھنکار کی جو نظمیں ہیں مثلاً "اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے" یہ نظم ایک پربھات پھیری کے لئے میں نے کہی اور اس میں پڑھی تھی۔ شہر میں ستیہ گرہ بھی ہو رہی تھی۔ بدیشی کپڑے دوکانوں سے نکال نکال کے جلائے جا رہے تھے۔ امین آباد میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دوکان تھی اس میں سے بدیشی کپڑوں کے تھان نکال کے سڑک پر جلائے جا رہے

تھے۔ میں بھی اس دلچسپ کام میں شریک ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں پولیس آ گئی۔ ہم سب پکڑے گئے اور میں بھی۔ جب ایک حوالدار نے میرا بازو پکڑ کے مجھے اپنی لاری میں بٹھایا تو میں نے دیکھا کہ میرے محلے کا ایک لڑکا کچھ دور سائیکل روکے کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔ میں نے پکار کے اس سے کہا میرے گھر میں بتا دینا کہ میں جیل جا رہا ہوں۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں گاندھی جی اور جواہر لال کی صف میں شامل ہو گیا ہوں۔ نشہ اس وقت اترا جب عالم باغ پہونچ کے لاری رکی اور پولیس نے مجھے اور میری عمر کے کچھ اور لڑکوں کو اتار کے ہلکی سی ہماری کیننگ کی اور چھوڑ دیا کہ بس اب گھر بھاگ جاؤ۔ میرا دل ٹوٹ گیا میں سیدھا امین آباد کانگریس کے دفتر میں پہونچا اور میں نے پولیس کی شکایت کی کہ مجھے پولیس جیل نہیں لے گئی اب میں اپنے گھر جا کے کیا بتاؤں گا۔ ایک بزرگ لیڈر نے مجھے بہت تسلی دی، ابھی تم بہت کم سن ہو لیکن جیل جانے کا اتنا شوق ہے تو کام کرتے رہو کسی دن جیل چلے ہی جاؤ گے۔ میں آنسو بھرے ہوئے گھر لوٹ آیا اور سوچنے لگا کہ ایسا کام کرنا چاہئے کہ ضرور ہی جیل جاؤں۔ ہمارے گروپ میں ایک بنگالی نوجوان بھی تھا۔ اس نے ہم کو بم بنانے کا نسخہ دیا۔ ہم نے بم بنایا اور طے کیا کہ وزیر گنج تھانے پر ہم بم پھینکیں گے جس کے انسپکٹر نے ہم کو چھوڑ دیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ جب بم تیار ہو گیا تو مجھے یہ فکر ہوئی کہ تھانے پر پھینکنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ بم بنا بھی ہے یا نہیں۔ ہم لوگ گومتی کے کنارے شمشان گھاٹ کی طرف گئے اور وہاں سناٹے میں ہم نے بم کی آزمائش کی تو معلوم ہوا کہ وہ انار بن گیا تھا (آتش بازی والا)۔ میں نے اپنے بنگالی دوست کو خوب گالیاں دیں مار پیٹ بھی ہوئی اور اس کو اپنے گروپ سے نکال دیا۔

بہت دنوں تک اسی طرح بھٹکتا رہا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس وقت ایک ایسا رومانٹک حادثہ ہوا کہ میں لکھنؤ چھوڑ کے کانپور چلا گیا۔ وہاں

مزدور سبھا کے کارکنوں کا ساتھ ہوا۔ وہ چوری چوری مجھے کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر دینے لگے۔ اب مجھے وہ راستہ مل گیا جس پر میں نے زندگی کا اتنا لمبا سفر طے کیا ہے اور باوجود مفلوج ہو جانے کے اب تک اسی راستے پر چل رہا ہوں۔ ایک دن اسی راستے پر گروں گا اور سفر ختم ہو جائے گا منزل پر یا منزل کے قریب۔

کیفی اعظمی

۷ر نومبر ۱۹۸۹ء

☆☆

جھنکار

۱۹۴۳ء

ترتیب

☆۔ پیش لفظ — سجاد ظہیر ---------- ۲۷
۱۔ ماحول ---------- ۳۳
۲۔ صبح وطن ---------- ۳۴
۳۔ یہودی کی خودکشی ---------- ۳۵
۴۔ دستورِ عشق ---------- ۳۹
۵۔ مقفیہ ---------- ۴۰
۶۔ قتل کے درپے ---------- ۴۲
۷۔ پاسری کا پہرا ---------- ۴۶
۸۔ آواز کی شکست ---------- ۴۷
۹۔ کہرے کا کھیت ---------- ۵۱
۱۰۔ نرس کی موت اور وصیت ---------- ۵۳
۱۱۔ جوہر ---------- ۵۷
۱۲۔ پیتل کے کنگن ---------- ۵۹
۱۳۔ برسات کی ایک رات ---------- ۶۰
۱۴۔ آدمی ---------- ۶۲
۱۵۔ دوشیزہ ماں ---------- ۶۳
۱۶۔ شام ---------- ۶۷
۱۷۔ مشورے ---------- ۶۸
۱۸۔ مچھلیں ---------- ۶۹
۱۹۔ سویرے سویرے ---------- ۷۰
۲۰۔ تاج ---------- ۷۱
۲۱۔ اقدارِ اشتباب کا زمانہ ---------- ۷۳
۲۲۔ معذرت ---------- ۷۵
۲۳۔ رقاص شرارہ ---------- ۷۶
۲۴۔ تکلف ---------- ۷۷
۲۵۔ پہلا سلام ---------- ۷۹
۲۶۔ بیکاری ---------- ۸۰
۲۷۔ لیڈر کی آمد ---------- ۸۳

۲۸۔ عورت ---------- ۸۵
۲۹۔ حقیقتیں ---------- ۸۸
۳۰۔ تجربے ---------- ۹۱
۳۱۔ اخفائے محبت ---------- ۹۳
۳۲۔ آخری جنگ ---------- ۹۵
۳۳۔ موجودہ جنگ اور ترقی پسند عناصر ---------- ۹۸
۳۴۔ آخری امتحان ---------- ۱۰۰
۳۵۔ نوجواں ---------- ۱۰۱
۳۶۔ گلدستہ ---------- ۱۰۳
۳۷۔ سرخ فوج ---------- ۱۰۴
۳۸۔ روسی عورت کا نعرہ ---------- ۱۰۶
۳۹۔ استالن کا فرمان ---------- ۱۰۸
۴۰۔ تاج محل ---------- ۱۱۰
۴۱۔ استالن ---------- ۱۱۲
۴۲۔ اتحاد ---------- ۱۱۳
۴۳۔ اتحادیوں کے نام ---------- ۱۱۶
۴۴۔ بنگال ---------- ۱۱۸
۴۵۔ اعتراف ---------- ۱۲۱
۴۶۔ استقبال ---------- ۱۲۳
۴۷۔ قطعہ ---------- ۱۲۷
۴۸۔ روسی عوام اور جنگ ---------- ۱۲۸
۴۹۔ ساقی ---------- ۱۳۰
۵۰۔ گورکی کی اپیل ---------- ۱۳۲
۵۱۔ بیکار مزدور ---------- ۱۳۴
۵۲۔ انجمنیں ---------- ۱۳۵
۵۳۔ برما کا چاول ---------- ۱۳۷
۵۴۔ کیا یہ وہی عہد؟ ---------- ۱۳۹
۵۵۔ نئی صبح ---------- ۱۴۲
۵۶۔ مغالطہ ---------- ۱۴۴

☆☆☆

گئی۔ پرانے ترقی پسند ادیبوں میں چند کو چھوڑ کر زیادہ تر ایسے ہیں جو خاموش ہیں۔ اور اس دور کے اکثر نوجوان ادیبوں میں سے اس گم گشتگی کے عالم میں بعض تو جام و سبو میں، بعض نے جنسی بے اعتدالی میں، بعض نے یاس پرستی اور بعض نے ابہامیت یا خالصاً مہمل گوئی کے دامن میں پناہ لی ہے۔ الغرض یہ کہ وہ گھوم پھر کر ابتذال و ضلالت کی اُس پرانی منزل پر پہونچ رہے ہیں جس کے برخلاف ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے بغاوت کا سرخ پرچم بلند کر کے اُردو ادب میں ایک نئی زندگی اور ایک انوکھی شان پیدا کر دی تھی۔ ابھی تو "پرانے" رجعت پرست ان فحش نگاروں و مہمل گویوں کو "ترقی پسند" کا نام دے کر ساری ترقی پسند تحریک کو بدنام کر رہے ہیں۔ بہت جلد ہم یہ سماں بھی دیکھیں گے کہ ترقی پسندوں پر اعتراض کرنے والے ان جدید رجعت پرستوں کے کلام کو اسی طرح حوالے لے کر پڑھیں گے جس طرح کوک شاستر یا چرکین یا جان صاحب کا کلام بلاغت نظام ہمارے اخلاق مآب روسا کے یہاں اب بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

کیفی کی شاعری قدیم و جدید دونوں قسم کی ادبی غلاظتوں سے پاک ہے۔ اس میں سچی ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کا خیال نصب العین صاف و متعین، اس کا طرز بیان سیدھا اور براہ راست اُس کی تشبیہیں و استعارے نئے اور دلکش ہیں۔ وہ اشتراکیت کا پُر جوش حامی ہے، سوویت روس کا گہرا دوست ہے اور اب ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا رکن بھی ہے۔ اس کے خیال و مقصد حیات، اس کی زندگی اور عمل میں تضاد نہیں۔ اگر وہ انقلاب اور حرّ و دراج کے گن گاتا ہے تو اُسے اس کا حق ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنی زندگی کو محنت کشوں کی خدمت اور ان کی جدوجہد میں شرکت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ جدید دور کے ترقی پسند شاعر اسی قسم کے ہوں گے، وہ غالباً پہلے کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے کم ہوں گے، لیکن ان کی گفتار و کردار میں ہم آہنگی کی وجہ سے ان کے کلام میں خلوص اور سچائی کا عنصر پہلے سے زیادہ ہوگا۔ وہ نئی صبح کا نقشہ کیفی کی طرح کچھ یوں دیکھیں گے:

پیش لفظ

جدید اُردو شاعری کے باغ میں ایک نیا پھول کھلا ہے، ایک سُرخ پھول۔

کیفی اعظمی سے میری واقفیت ایک سال سے بھی کم کی ہے۔ ان سے ملاقات کو چھ مہینے بھی ابھی نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنی دو تین نظمیں "قومی جنگ" کو بھیجیں لیکن اپنا پتہ نہ لکھا۔ نظمیں اچھی تھیں اس لئے شائع کر دی گئیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ شخص شاید کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہے۔ اس کا لاپتہ ہونا مجبوری ہے اور یہی شاید اس کی شرمندگی اور منہ چھپانے کی وجہ بھی ہے۔ بہر حال ہماری کھوج جاری رہی۔ بڑی مشکل سے علی سردار جعفری کی رہنمائی میں لکھنؤ کے کچھ رفیقوں نے کیفی کو ڈھونڈ نکالا۔ ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک طالب علم قسم کے نوجوان ہیں جن کی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ عربی مدرسوں میں عربی فارسی کے امتحانوں کی سندیں حاصل کر لینے کے بعد تھوڑی ہی مدت پہلے ختم ہو چکا ہے۔ انگریزی زبان سے ناواقف ہیں اسے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں، بے روزگار ہیں، اپنا کوئی گھر نہیں، اسی سبب سے لاپتہ تھے۔ اس کے بعد ہم نے ان سے کہا کہ اپنی تمام انقلابی نظمیں ہمارے پاس بھیج دیں۔ یہ کوئی پندرہ بیس ہوں گی۔ ہم "قومی جنگ" کے ادارے والے انھیں پڑھ کر حیران رہ گئے۔

جنگ کے اس دور میں جب سے کہ سوویت یونین پر ہٹلری حملہ ہوا ہے، اور ہندوستان کی سرحدوں پر جاپانی قزاق آن بیٹھے ہیں، ہمارے بہت سے نوجوان ادیبوں پر روحانی اور ذہنی تعطّل سا طاری ہے۔ جنگ کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے دلخراش حالات اور ملک میں سیاسی جمود کا پرتو ان کے دماغوں پر بھی پڑا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انقلاب کی وہ راہ جس پر وہ چار پانچ سال پہلے اتنی تیزی سے گامزن تھے، یکا یک کہاں کھو

یہ سادہ سادہ گروہوں، یہ تبسم آفریں سورج
یورپ کامیابی سے ہو استالن گن جیسے
ابلتی سرخیوں کی زد پہ جلتے ہیں سیاہی کے
پڑی ہو آگ میں بکھری غلامی کی رسن جیسے
شفق کی چادریں رنگیں فضا میں تھرتھراتی ہیں
اڑائے لال جھنڈا اشتراکی انجمن جیسے

اور فیکٹریوں کی اونچی اونچی چمنیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر انھیں خیال آئے گا:

دامنِ تار پہ جابجا نقش گیر
خونِ مزدور کی آڑی ترچھی لکیر
یہ دھواں، آہ کیفی یہ اندھا دھواں
ایک مدت سے ہے جو یوں ہی پُرفشاں
سطح سے تیغ خودی کی ابھرے اگر
توڑ لے چاند تارے ابھی جھوم کر
ارتقا جلوۂ نو دکھانے لگے
بن کے جنت زمیں جگمگانے لگے

یہ فیکٹریاں اور کارخانے اگر سرمایہ داروں کی ملکیت سے نکل کر اشتراکی ملکیت بن جائیں تو زمین جنت بنائی جا سکتی ہے۔ لیکن سرمایہ داری کی تباہ کاریوں کا اس وقت کوئی حساب نہیں۔ سنئے:

ملکیت نے پرِ شہبازِ ہنر توڑ لئے
نخلِ فطرت کے حسیں برگ و ثمر توڑ لئے
حرص میں دامنِ گیتی کے گہر توڑ لئے
اور بس چلتا تو کل شمس و قمر توڑ لئے
افقِ دہر پہ ظلمت کے سوا کچھ بھی نہیں

فاشزم اسی قسم کی سرمایہ داری کی ایک صورت ہے۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ دنیا کے پہلے اشتراکی نظامِ حیات، یعنی سوویت یونین کو تباہ کر دے۔ لیکن اُسے منہ کی کھانی پڑی۔ اشتراکی نظام نے پچیس سال میں ایسے انسان پیدا کر دئے جو شکست کھا ہی نہیں سکتے۔ نازیوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ:

غیر ممکن ہے کبھی دام میں آنا ان کا
ان کی راتوں کے بھی ماتھے پہ ہے پرتو دن کا
ان کے سینوں میں دھڑکتا ہے دلِ استالن کا
ان میں سب خضر ہیں یہ ٹھوکریں کھائیں کیوں کر

اور ان کا رہنما استالن جیسا شخص ہے۔ ایک معمولی مزدور، جو آج ساری آزادی پسند دنیا کا رہنما بن گیا ہے۔ کیفی نے اس کی بڑی سچی اور دلکش تصویر کھینچی ہے:

تیرے سر پہ ہے انقلاب کا تاج
دوشِ تعمیر پہ ہے ہات ترا
جنگ اور اپنے خونیوں سے جنگ
اک شکن بھی مگر جبیں پہ نہیں
اپنی دھن، اپنی راہ، اپنا کام
زنگِ اوہام کا یقیں پہ نہیں!

کیفی اپنے ہم وطنوں کو بھی جہد و عمل کا پُرجوش پیام دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس انقلابی دور میں اس کی قوم بھی متحد و منظم ہو کر آزادی کی عالمگیر جنگ میں شریک ہو۔ وہ اس مذبذب اور فرسودہ تخیل سے کوسوں دور ہے جس کا مقصد اپنی شریکِ زندگی کو "تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گی!" کہہ کر ٹال دینا ہے۔ جنسِ لطیف کی اس سے بڑھ کر ذلت اور کیا ہو سکتی ہے!؟ اس کے برخلاف کیفی کا اصرار ہے کہ۔۔۔ اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے!

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اُڑنے کھلنے میں ہے نہت خمِ گیسو میں نہیں!

یہ ہے کیفی کے تخیل اور ان کے انقلابی و اشتراکی نظموں کا رنگ۔۔۔ اس کے علاوہ اس مجموعہ میں اور بھی نظمیں ہیں جو بالکل غیر سیاسی ہیں۔ غرضکہ یہ ان کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ کیفی ابھی نوجوان ہیں، ان کی عمر اس وقت ۲۶ سال سے کم ہے اور "جھنکار" کی تمام نظمیں، غالباً گذشتہ تین سال کے اندر کہی گئی ہیں۔ کسی شاعر کی شاعرانہ زندگی کا آغاز مشکل سے اس سے بہتر ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ اُمید افزا بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں معنویت اور فن دونوں کے اعتبار سے تدریجی ترقی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی اُن کے کلام میں وہ گہرائیاں پیدا نہیں ہوئیں جو صرف علمی عبور، نیز مشاہدے اور کثیر تجربوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ زورِ کلام اور فصاحتِ بیان، مشاہدے، خیال، علم اور ادراک کی کمی پوری نہیں کر سکتے۔ انسانی جذبات کو متحرک کرنا شاعری کا کام ہے لیکن اگر اس کے معنے یہ ہیں کہ شعر دلوں کو سرور اور حیاتِ انسانی کو تابندہ و منور کرے، روح کو بالیدگی بخشے، نفس کو طمانیت اور آئینۂ عقل کو صیقل، تو پھر اس کی منزل بہت دشوار ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ "بہترین شاعری جزویت از پیغمبری" ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ کیفی اس اعلیٰ و ارفع منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت ان کی بہترین تعریف یہی ہے کہ اُن کا رُخ صحیح طرف ہے اور ان کے قدم برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔

سجاد ظہیر

بمبئی۔ مارچ ۱۹۴۳ء

ماحول

طبیعت جبرِ تسکیں سے گھبرائی جاتی ہے
ہنسوں کیسے ہنسی کمبخت تو مرجھائی جاتی ہے
بہت چمکا رہا ہوں خال و خط کو سعیِ رنگیں سے
مگر پژمردگی سی خال و خط پر چھائی جاتی ہے
امیدوں کی تجلی خوب برسی شیشۂ دل پر
مگر جو گرد تھی تہ میں وہ اب تک پائی جاتی ہے
جوانی چھیڑتی ہے لاکھ خوابیدہ تمنا کو
تمنا ہے کہ اس کو نیند ہی سی آئی جاتی ہے
محبت کی نگوں ساری سے دل ڈوبا سا رہتا ہے
محبت دل کے اضمحلال سے شرمائی جاتی ہے
فضا کا سوگ اترا آ رہا ہے ہر طرف ہستی میں   نگاہِ شوق، روحِ آرزو کجلائی جاتی ہے
یہ رنگِ مے نہیں ساقی جھلک ہے خوں شدہ دل کی
جو اک دھندلی سی سُرخی انکھڑیوں میں پائی جاتی ہے
مرے مطرب نہ دے للہ مجھکو دعوتِ نغمہ   کہیں سازِ غلامی پر غزل بھی گائی جاتی ہے

☆☆

صبحِ وطن

یہ رسیلی سحر یہ بھیگی فضا | یہ دھندلکا یہ مست نظارے
مے میں غلطاں ہے ڈوبتا مہتاب | رس میں ڈوبے ہیں جھلکتے تارے
بے تکلف سماں یہ جنگل کا | حور دیکھے تو خلد کو وارے
یہ گھنے نخل یہ ہرے پودے | جن میں ٹانکے ہیں اوس نے تارے
ہائے یہ سرخ سرخ ڈھاک کے پھول | ٹھنڈے ٹھنڈے دہکتے انگارے

(۲)

مسکرایا وہ طفلکِ مشرق | جگمگائے وہ دشت و در سارے
لی شعاعوں نے تن کے انگڑائی | رنگ کر نور کے بہے دھارے
کرنیں چمکیں وہ رنگ سا برسا | وہ چھٹے سرخ و زرد فوارے
وہ گلوں کی دھڑک اٹھی چھاتی | وہ خوش الحان باغ چہکارے

کس کو پہلے سے ہم اٹھا کے دکھائیں
آج صبحِ وطن کے نظارے
اور سب کچھ ہے تم نہیں لیکن
تم نہیں ہو تو کچھ نہیں پیارے

☆☆

بیوہ کی خودکشی

یہ اندھیری رات یہ ساری فضا سوئی ہوئی
پتی پتی منظرِ خاموش میں کھوئی ہوئی
موجزن ہے بحرِ ظلمت تیرگی کا جوش ہے
شام ہی سے آج قندیلِ فلک خاموش ہے
چند تارے ہیں بھی تو بے نور چھترائے ہوئے
جیسے باسی ہار میں ہوں پھول کمھلائے ہوئے
چھپ گیا ہے یوں گھٹا میں چاندنی کا صاف رنگ
جس طرح مایوسیوں میں دب کے رہ جائے امنگ
امڈی ہے کالی گھٹا دنیا ڈبونے کے لئے
یا چلی ہے بال کھولے رانڈ رونے کے لئے
جتنی ہے گنجان بستی اتنی ہی ویران ہے
ہر گلی خاموش ہے ہر راستہ سنسان ہے
اک مکاں سے بھی مکیں کی کچھ خبر ملتی نہیں
چلمنیں اٹھتی نہیں زنجیرِ در ہلتی نہیں
سوئے ہیں مست و بے خود گھر کے کل پیر و جواں
ہو گئی ہیں بند حسن و عشق میں سرگوشیاں

ہاں مگر اک سمت اک گوشے میں کوئی نوحہ گر
لے رہی ہے کروٹوں پر کروٹیں دل تھام کر
دل سنبھلتا ہی نہیں ہے سینۂ صد چاک میں
پھول سا چہرہ اٹا ہے بیوگی کی خاک میں
اُڑ چلی ہے رنگِ رُخ بن کر حیاتِ مستعار
ہو رہا ہے قلبِ مردہ میں جوانی کا فشار
حسرتیں دم توڑتی ہیں یاس کی آغوش میں
سیکڑوں شکوے مچلتے ہیں لبِ خاموش میں
عمر آمادہ نہیں مردہ پرستی کے لیے
بار ہے یہ زندہ میت دوشِ ہستی کے لیے
چاہتی ہے لاکھ قابو دل پہ پاتی ہی نہیں
ہائے رے ظالم جوانی بس میں آتی ہی نہیں
تھرتھرا کر گرتی ہے جب سونے بستر پر نظر
لے کے اک کروٹ پٹک دیتی ہے وہ تکیہ پہ سر
جب کھنک اُٹھتی ہیں سوتی لڑکیوں کی چوڑیاں
آہ بن کر اُٹھنے لگتا ہے کلیجے سے دھواں
ہوگئی بیوہ کی خاطر نیند بھی جیسے حرام
مختصر سا عہدِ وصلت دے گیا سوزِ دوام
دوپہر کی چھاؤں دورِ شادمانی ہوگیا
پیاس بھی بجھنے نہ پائی ختم پانی ہوگیا

لے رہی ہے کروٹوں پر کروٹیں با اضطرار
آگ میں پارہ ہے یا بستر پہ جسمِ بے قرار
پڑ گئی اک آہ کر کے رو کے اُٹھ بیٹھی کبھی
انگلیوں میں لے کے زلفِ خم بہ خم اینٹھی کبھی
آ کے ہونٹوں پر کبھی مایوس آہیں تھم گئیں
اور کبھی سونی کلائی پر نگاہیں جم گئیں
اتنی دنیا میں کہیں اپنی جگہ پاتی نہیں
یاس اس حد کی کہ شوہر کی بھی یاد آتی نہیں
آ رہے ہیں یاد پیہم ساس نندوں کے سلوک
پھٹ رہا ہے غم سے سینہ اُٹھ رہی ہے دل میں ہوک
اپنی ماں بہنوں کا بھی آنکھیں چرانا یاد ہے
ایسی دُنیا میں کسی کا چھوڑ جانا یاد ہے
باغباں تو قبر میں ہے کون اب دیکھے بہار
خود اسی کو تیر اس کے کرنے والے ہیں شکار
جب نظر آتا نہیں دیتا کوئی بیکس کا ساتھ
زہر کی شیشی کی جانب خود بخود بڑھتا ہے ہاتھ
دل تڑپ کر کہہ رہا ہے جلد اس دُنیا کو چھوڑ
چوڑیاں توڑیں تو پھر زنجیرِ ہستی کو بھی توڑ

دم اگر نکلا تو کھوئی زندگی مل جائے گی
یہ نہیں تو خیر تنہا قبر ہی مل جائے گی
واں تجھے ذلت کی نظروں سے نہ دیکھے گا کوئی
چاہے ہنسنا چاہے رونا پھر نہ روکے گا کوئی
واں سب اہلِ درد ہیں سب منصفِ انصاف ہیں
رہبر آگے جا چکا راہیں بھی تیری صاف ہیں
دل انہیں باتوں میں الجھا تھا کہ دم گھبرا گیا
ہاتھ لے کر زہر کی شیشی لبوں تک آ گیا
تلملاتی آنکھ جھپکاتی، جھجکتی ہانپتی
پی گئی کل زہر آخر تھرتھراتی کانپتی
موت نے جھٹکا دیا کل عضو ڈھیلے ہو گئے
سانس اکھڑی، نبض ڈوبی، ہونٹ نیلے ہو گئے
آنکھ جھپکی اشک ٹپکا ہچکی آئی کھو گئی
موت کی آغوش میں اک آہ بھر کر سو گئی

اور کر اک آہ سلگے ہند کی رسموں کا دام
اے جواں مرگ بیوہ تجھ پہ کیفی کا سلام

☆☆

دستورِ بخشش

لبالب ہیں کہیں ساغر کہیں خالی پیالے ہیں
یہ کیسا دور ہے ساقی یہ کیا تقسیم ہے ساقی

نہیں پہچانتا تیور ابھی تو تشنہ کاموں کے
ترا دستورِ بخشش لائقِ ترمیم ہے ساقی

☆☆

مغنّیہ

وہ شام تھی کتنی مست و بیخود جو مجھکو بے خود بنا رہی تھی
اک آگ دل کی بجھا رہی تھی اک آگ دل میں لگا رہی تھی

نفس میں حل ہو رہی تھیں پیہم ہوا کی پر کیف و نرم لہریں
فضا کی مستی سمٹ سمٹ کر دل و نظر میں سما رہی تھی

دھواں دھواں تھا شفق کا چہرہ بجھی بجھی تھیں سنہری کرنیں
ہر ایک شے میں تھی بیخودی سی ہر ایک شے سوئی جا رہی تھی

دھنک کی رنگین دھاریوں پر بھی ڈال دی تھی گھٹا نے چادر
گھٹا کی چادر میں بھی مچلتی ہوئی دھنک جگمگا رہی تھی

نہ شام تھی وہ نہ جھٹپٹا تھا اٹھی تھی اک بھاپ میکدے سے
جو رنگ بن کر برس رہی تھی جو خامشی بن کے چھا رہی تھی

اسی لطیف اور خنک ہوا میں اسی جمیل اور حسین فضا میں
کھڑی ہوئی رہ گزر پہ کوئی جواں فسوں ساز گا رہی تھی

وہ بانسری کی لطیف لہریں، لطیف لہروں میں اس کے نغمے
زمانہ مسحور ہو رہا تھا خدائی ہچکولے کھا رہی تھی

نظر میں موسیقیت تھی لرزاں مچل رہے تھے نفس میں نغمے
شباب بھی گنگنا رہا تھا حیات بھی گنگنا رہی تھی

نگاہ نغمہ، خرام نغمہ، کلام نغمہ، پیام نغمہ
ہوا میں نغمے سمو رہی تھی فضا میں نغمے گھلا رہی تھی

سلونے ہونٹوں کی لرزشوں میں تھی پرفشاں روح میکدے کی
نظر کی سرشاریوں میں تخئیل ساحری تھرتھرا رہی تھی

اسی کے جلوے اسی کا پرتو اسی کے نغمے اسی کا جادو
اسی کی دنیا بسی ہوئی تھی جدھر وہ نظریں اٹھا رہی تھی

دلوں کی حالت الٰہی توبہ رخوں کی رنگت الٰہی توبہ
کبھی کوئی لہر آ رہی تھی کبھی کوئی لہر جا رہی تھی

ادا میں نرمی نوا میں گرمی نگہ میں شوخی مژہ میں جادو
ہر اک کو مست و خراب کر کے ہر ایک پر مسکرا رہی تھی

کبھی نظر سے نظر ملا کر کبھی نظر سے نظر بچا کر
ڈبو رہی تھی مٹا رہی تھی پلا رہی تھی چھکا رہی تھی

ہر اک سے بیگانہ بن رہی تھی دلوں کو دے دے کے نرم جھٹکے
نہ میں کسی کی نہ کوئی میرا یہ اجنبیت بتا رہی تھی

لبوں پہ جاں کھنچ کے آ گئی تھی بگڑ چلا تھا نظام ہستی
وہ مست لہروں میں بانسری کی دلوں کو جھولا جھلا رہی تھی

کہیں وہی شام آئے کیفی میں ڈوب جاؤں وہ گائے کیفی
اسی طرح پھر مٹائے کیفی کہ جس طرح سے مٹا رہی تھی

☆☆

جیل کے در پر

اک مجسّم جرأت و غیرت سراپا انقلاب
کھا رہا تھا جیل کے در پر ہزاروں پیچ و تاب
آنکھ میں خونِ بغاوت قلب میں حبِّ وطن
آگ جیسی جتونوں میں انگڑیوں میں بانکپن
تپتی سانسوں میں شرر پارے بگولے آندھیاں
تلملاتی تیوریوں میں تھرتھراتی بجلیاں
خود سراپا اپنے ہر محکم ارادے کا ثبوت
ہند کی پونجی وطن کی لاج بھارت کا سپوت
چوٹ سی کھاتا تھا دل پر قیدیوں کو دیکھ کر
بے ارادہ توڑ دیتا تھا سلاخوں کی کمر
در سے لڑتی تھیں اُمنگیں یوں دلِ بیتاب کی
جس طرح بندھے سے ٹکراتی ہے رو سیلاب کی

جیل پیکر سنتری پھرتے تھے بل کھاتے ہوئے
سازِ جوتوں کے غلامی کی تھے دُھن گاتے ہوئے
پاس ہی در کے کھڑی تھی اک ضعیفہ بدحواس
جیل میں فرزند پہلو میں بہو چہرہ اُداس

دیکھتی تھی گہہ پسر کو گاہ سوئے آسماں
فرطِ غم سے تھرتھراتی تھیں بدن کی جھرّیاں
کہہ رہی تھی نظروں نظروں میں کلیجہ تھام کر
لے مری گاڑھی کمائی اے مرے پیارے پسر
تو تو بچپن ہی کا ضدی ہے، یہ ماں تجھ پر فدا
پہلے کب سنتا تھا مانے گا جو اب کہنا مرا
راہ پر لاؤں تجھے کس طرح کس تدبیر سے
نا سمجھ، نادان لڑنا چھوڑ دے تقدیر سے
یہ نہیں کہتی کہ دے اپنی ضعیفہ ماں کا ساتھ
بے حمیت غیر کی لڑکی کا کیوں پکڑا تھا ہاتھ
اک نظر للہ اس کی بے زبانی دیکھ لے
حوصلوں کی رو اُمنگوں کی جوانی دیکھ لے
شرم و الفت میں گھُٹی جاتی ہے ہر موجِ نفس
اشک بن کر نرگسی آنکھوں میں کھنچ آیا ہے رس
بیاہ کے لایا تھا اس کو دُکھ اُٹھانے کے لئے
ہائے یہ آنکھیں نہ تھیں آنسو بہانے کے لئے

وہ اِدھر گرمِ تکلّم تھا عجب انداز میں
حریّت لو دے رہی تھی شعلۂ آواز میں

کہہ رہا تھا مضمحل چہرے پہ نظریں گاڑ کر
اے مری ماں اے مری غمخوار میری نوحہ گر
میرے دل کی آگ یہ آنسو بجھا سکتے نہیں
چند قطرے بھرے طوفاں کو دبا سکتے نہیں
آہ جس پر بوجھ دیتا ہو پھولوں کا بھی ہار
کس طرح دیکھوں کنیزی کا اسی گردن پہ بار
عورتیں دُنیا کی ہوں مصروف تزئین دوام
اور ہماری عورتوں کا حق کہ وہ ڈھالیں غلام
اپنے بادل اُٹھ کے کشتِ غیر پر برسا کریں
ہم بھکاری قطرے قطرے کیلئے ترسا کریں
کچھ خبر ہے رو رہی ہے مادرِ ہندوستاں
ڈگمگاتی ہے زمیں تھرا رہا ہے آسماں
ظلم و استبداد کے چھائے ہیں بادل چار سو
حل کیا جاتا ہے سکوں میں غریبوں کا لہو
بیکسوں کی آہ بھی اہلِ دول سنتے نہیں
گل کے بندے باغ سے کانٹے کبھی چنتے نہیں
دے رہا ہے دم بدم ہم کو صدا ہندوستاں
بن نہیں سکتی ہیں اب قدموں کا لنگر بیڑیاں

کانپتا ہے چرخِ فتنہ ساز ہلتی ہے زمیں
ہند کے بھوکوں نے اُلٹی ہے گرج کر آستیں
مل نہیں سکتی وطن میں اب غلامی کو پناہ
خار و خس بھی بجلیوں پر گرم کرتے ہیں نگاہ
آستانِ جبر پر اب جبہ سائی ہو چکی
اہرمن سیرت خداؤں کی خدائی ہو چکی
دفعتاً پیدا ہوا کچھ قیدیوں میں خلفشار
آ گیا بیوی کو اس تپتے ہوئے لہجے پہ پیار
دوڑ کر ڈالا گلے میں ہار پھر شرما گئی
مادرِ ہندوستاں کے رُخ پہ سُرخی چھا گئی
کہہ اُٹھا کیفی ہر اک ذرہ بصد قہر و عتاب
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

☆☆

بانسری کا لہرا

نہ جانے چاند یہ تھرا رہا ہے
کہ کوئی جام سے چھلکا رہا ہے
زمیں آئینہ ہوتی جا رہی ہے
فلک کافور سا برسا رہا ہے
کھلا جاتا ہے کہرہ چاندنی میں
دھواں سیماب بنتا جا رہا ہے
شعاعیں قید ہیں دامِ ہوا میں
فضا میں رنگ سا بل کھا رہا ہے
ہوائیں اس طرح اٹھلا رہی ہیں
کہ رس پودوں کا چھلکا جا رہا ہے

جہاں پر اک خموشی چھا رہی ہے
خموشی پر ترنم چھا رہا ہے

کسی نے بانسری بھی لو بجا دی
ارے کوئی قیامت ڈھا رہا ہے
سکوتِ شب کا خواب آور فسانہ
سروں میں جذب ہوتا جا رہا ہے
اُبھرتی جاتی ہیں رہ رہ کے تانیں
فلک تھرا کے اُٹھتا جا رہا ہے
سمٹتا ہے سکڑتا ہے اُجالا
مہ و انجم کو غش سا آ رہا ہے
زمیں محور پہ گھومی جا رہی ہے
فلک مرکز پہ جھوما جا رہا ہے
خلا میں بس رہی ہیں مست تانیں
دلِ ارض و سما لہرا رہا ہے
ستارے دے رہے ہیں تال پیہم
ہر اک ذرہ تھرک کر گا رہا ہے
ہوا میں اُٹھ رہی ہیں ایسی لہریں
کہ خود نغمہ جھکولے کھا رہا ہے
نہ جانے کیوں ہر اک میٹھی نوا پر
دلِ ناکام بیٹھا جا رہا ہے

کسی کی شکل پھرتی ہے نظر میں
کوئی بھولا ہوا یاد آ رہا ہے

☆☆

آواز کی شکست

سپاہی۔۔
ایک موہوم آواز۔۔۔۔

منظر

یہ تاریک جادہ، یہ پُر ہول جنگل
جلائی ہے غولِ بیاباں نے مشعل
درختوں کے نیچے ہے وحشت کا ڈیرا
ہواؤں میں حل ہو رہا ہے اندھیرا
اندھیرے میں احساس یہ بھی نہیں ہے
زمیں پہ فلک یا فلک پہ زمیں ہے

بھیانک خموشی کے اللہ رے تیور
کہ بجتے ہیں کان آپ اپنی صدا پر

سپاہی:

لئے ولولہ جنگ کا سر جھکائے
چلا جا رہا ہوں قدم کو بڑھائے
وطن کے لئے جاں گنوانے چلا ہوں
نشانِ غلامی مٹانے چلا ہوں
کڑی جھیل لوں گا مصائب سہوں گا
رہوں گا تو آزاد ہو کر رہوں گا
وطن کے لئے سب کو چھوڑا ہے میں نے
بڑے آبگینوں کو توڑا ہے میں نے
جو اک حورِ ارضی ہے میری نظر میں
سسکتا اسے چھوڑ آیا ہوں گھر میں

گوارا ہے اس کی بھی مجھ کو جدائی
ارے کس طرف سے یہ آواز آئی

آواز:۔

میں جانے نہ دونگی میں جانے نہ دونگی — متاع جوانی لٹانے نہ دونگی

مجھے ساتھ لے لو تو گھر سے جدا ہو
میں تم پر مٹوں تم وطن پر فدا ہو

مگر اس طرح جاں گنوانے نہ دونگی — میں جانے نہ دونگی میں جانے نہ دونگی

سپاہی:

یہ لہجہ تو جیسے میں پہچانتا ہوں! — اسی کی یہ آواز ہے جانتا ہوں!!
تو کیا واقعی یہ وہی گا رہی ہے؟ — نہیں مجھ پہ دیوانگی چھا رہی ہے
بہت دور میں آپکا چھوڑ کر گھر — یہاں تک صدا اسکی آئیگی کیونکر
کوئی اور شاید یہ اندوہگیں ہے — مگر کیوں مرا پاؤں اٹھتا نہیں ہے
ارے! آستیں میں نمی ہے یہ کیسی! — لپٹ کر کہیں وہ تو روئی نہیں تھی

مگر کچھ بھی ہو اب میں رکتا نہیں ہوں — کہ بار غلامی سے اندوہگیں ہوں
سلگتا ہے کس طرح سینہ نہ پوچھو — نہ پوچھو غلامی کا جینا نہ پوچھو
نفس سرد ہے نبض زار و حزیں ہے — یہ جینے کی ذلت ہے، جینا نہیں ہے
میں اس زندگی کو مٹا کر رہوں گا — غلامی کی دیوار ڈھا کر رہوں گا
چڑھاؤں گا پودوں پہ خنجر کا پانی — خس و خار کو بخشدوں گا جوانی

مٹادوں گا بندوں کا زعم خدائی
ارے! پھر کدھر سے یہ آواز آئی!!

آواز:

میں جانے نہ دونگی میں جانے نہ دونگی — تمہیں اپنے خوں میں نہانے نہ دونگی

قدم اب تم آگے بڑھاؤ تو جانوں
کسی طرح دامن چھڑاؤ تو جانوں

کسی طرح دامن چھڑانے نہ دونگی — میں جانے نہ دونگی میں جانے نہ دونگی

سپاہی:

طبیعت الجھتی ہے گھبرا رہی ہے — دھڑکتا ہے دل نبض تھرا رہی ہے
ارادوں کا چکرا رہا ہے سفینہ — ٹپکنے لگا لو جبیں سے پسینہ
اسی کی یہ دھن ہے وہی گا رہی ہے — مرے ساتھ روتی چلی آ رہی ہے

مگر وہ تو کمزور اتنی نہیں ہے — کوئی اور شاید یہ زار و حزیں ہے
کسی اور سے یہ بچھڑتا ہے کوئی — جو رو رو کے دامن پکڑتا ہے کوئی
بڑا سخت ہوتا ہے یہ مرحلہ بھی — کہ اس وقت ہلتا ہے عرش خدا بھی
یہی وقت ہے درد بے انتہا کا — یہی وقت ہے امتحان وفا کا
مگر اس کو روکیں گی کیونکر وفائیں — جسے وقت خود دے رہا ہو صدائیں
جو میری طرح جاں گنوانے چلا ہو — جو عرش غلامی کو ڈھانے چلا ہو

نہیں اس کو کہتے نہیں بیوفائی
ارے! پھر کدھر سے یہ آواز آئی!!

آواز:۔

میں جانے نہ دوں گی میں جانے نہ دوں گی   جدائی کو نزدیک آنے نہ دوں گی

بڑے چاہ والے بڑے پیار والے
مجھے کر چلے سوزِ جاں کے حوالے

نہیں آگ دل میں لگانے نہ دوں گی   میں جانے نہ دوں گی میں جانے نہ دوں گی

سپاہی:۔

الٰہی! الٰہی!! یہ کیا ماجرا ہے؟   یہ کس کی صدیں ہیں یہ کیسی صدا ہے؟
یہ دامن سے لپٹی ہے کس کی دہائی   کہ تھرّا رہا ہے وطن کا فدائی
کسی اور کی یہ صدا آ رہی ہے   کہ خود میری فطرت ہی بہکا رہی ہے
یہ کیا خامیاں اپنے ہی عزم کی ہیں   جو آواز بن کے مجھے روکتی ہیں

پرکھ لوں حقیقت پرکھ لوں ٹھہر کے   مگر پڑ چکے چرخ پر خط سحر کے
اسی کشمکش میں نہ ہو جائے تڑکا   وہ لو شعلۂ جنگ میداں میں بھڑکا
امنگیں اب احساس کو روندتی ہیں   رگوں میں مری بجلیاں کوندتی ہیں

غرورِ جنوں کے اشاروں پہ چل کے   قریب آ گیا لو میں دشتِ عمل کے
نظر اب ہے برچھی نفس اب ہے بھالا
جوانی، جوانی ترا بول بالا

کہرے کا کھیت

وہ سرد رات جبکہ سفر کر رہا تھا میں
رنگینیوں سے ظرف نظر بھر رہا تھا میں
تیزی سے جنگلوں میں اُڑی جا رہی تھی ریل
خوابیدہ کائنات کو چونکا رہی تھی ریل
مڑتی۔ اُچھلتی۔ کانپتی۔ چنگھاڑتی ہوئی
کہرے کی وہ دبیز ردا پھاڑتی ہوئی
پہیوں کی گردشوں میں مچلتی تھی راگنی
آہن سے آگ بن کے نکلتی تھی راگنی
پہنچی جدھر زمیں کا کلیجہ ہلا دیا
دامن میں تیرگی کے گریباں بنا دیا
جھونکے ہوا کے برف بچھاتے تھے راہ میں
جلوے سمارہے تھے لرز کر نگاہ میں
دھوکے سے چھو گئیں جو کہیں سرد انگلیاں
بچھو سا ڈنک مارنے لگتی تھیں کھڑکیاں
پچھلے پہر کا نرم دھندلکا تھا پرفشاں
مایوسیوں میں جیسے امیدوں کا کارواں
بے نور ہو کے ڈوبنے والا تھا ماہتاب
کہرے میں کھپ گئی تھی ستاروں کی آب و تاب

قبضہ سے تیرگی کے سحر چھوٹنے کو تھی
مشرق کے حاشیے میں کرن پھوٹنے کو تھی

کہرے میں تھا ڈھکے ہوئے باغوں کا یہ سماں
جس طرح زیرِ آب جھلکتی ہوں بستیاں

بھیگی ہوئی زمیں تھی نمی سی فضا میں تھی
اک کشتِ برف تھی کہ معلق ہوا میں تھی

جادو کے فرشِ سحر کے سب سقف و بام تھے
دوشِ ہوا پہ پریوں کے نیلمیں خیام تھے

تھی ٹھنڈے ٹھنڈے نور میں کھوئی ہوئی نگاہ
ڈھل کر فضا میں آئی تھی حوروں کی خوابگاہ

بن بن کے بھین سوئے فلک دیکھتا ہوا
دریا چلا تھا چھوڑ کے دامن زمین کا

اس شبنمی دھندلکے میں بگلے تھے یوں رواں
موجوں پہ مست ہو کے چلیں جیسے مچھلیاں

ڈالا کبھی فضاؤں میں خط کھو گئے کبھی
جھلکے کبھی افق میں نہاں ہو گئے کبھی

انجن سے اُڑ کے کانپتا پھرتا تھا یوں دھواں   لیتا تھا لہر کھیت میں کہرے کے آسماں

اس وقت کیا تھا روح پہ صدمہ نہ پوچھیے
یاد آ رہا تھا کس سے بچھڑنا نہ پوچھیے

دل میں کچھ ایسے گھاؤ تھے تیرِ ملال کے   رو رو دیا تھا کھڑکی سے گردن نکال کے

☆☆

سحر ـــــــ کی موت اور وصیّت

وہ روپہلی رات وہ چھلکے ہوئے نیلمیں ایاغ
جل رہے تھے چرخ کے سینہ پہ ہیرے کے چراغ
رنگ بن کر اُڑ رہی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی
نرم پودے سانس لے کر پی رہے تھے چاندنی
اُس طرف نازاں تھا گردوں اپنے سازو برگ پر
اس طرف کوئی تڑپتا تھا بساطِ مرگ پر

لے لیا تھا موت نے قبضے میں باغِ زندگی
آندھیوں کی زد پہ لرزاں تھا چراغِ زندگی
پیکرِ خاکی میں ایک شورِ وداعِ روح تھا
ہچکیوں کی ضرب سے جامِ بقا مجروح تھا
الاماں وہ اُلجھنیں، وہ جانکنی وہ خلفشار
دوش پہ سرکا تو سر پہ تھا خطابی سر کا بار
ڈوبتی جاتی تھی دل کے ساتھ نبضِ آرزو
ڈاکٹر بالیں پہ تھے حیران زمیں روبرو
صف بہ صف آ کر کھڑے تھے اس طرح سب خیر خواہ
روک رکھی تھی بظاہر موت کے آنے کی راہ

جن کے در تک جا نہیں سکتی غریبوں کی نظر
بے بُلائے آرہے تھے دوڑتے وہ ڈاکٹر
لگ رہی تھیں سوئیاں پیہم تنِ بیمار میں
روح تھامی جارہی تھی بجلیوں کے تار میں
بوجھ تھامے تھی دوا جسمِ نحیف و زار کا
سینک پشتیاں تھی گرتی ہوئی دیوار کا
جان و دل سے لیڈیاں حاضر تھیں خدمت کیلئے
حاکمانِ وقت آئے تھے عیادت کے لئے
نام بھی لیتا نہ تھا کوئی نشاطِ نوم کا
صحن میں اک ٹھٹ لگا تھا لیڈرانِ قوم کا
باریابی بابِ خلوت تک جو مشکل تھی ذرا
دور ہی سے صاحبِ دستار پڑھتے تھے دُعا
ہو رہا تھا خیریت خواہوں کی امیدوں کا خون
تار پر تار آرہے تھے فون پر ہوتے تھے فون
بام و در پر سوگ چھایا تھا محل تھا سوگوار
فرش تھا سکڑا ہوا رنگین پردے بیقرار
زرد برقی قمقمے تھے بیکسی تھی پرفشاں
تھرتھراتے لیمپوں کی بندھ گئی تھیں ہچکیاں

لے کے کروٹ دفعۃً بیمار نے کھولی زباں
ہٹ گئے بالیں سے رُخ پاتے ہی سارے نوحہ خواں
آگیا گھبرا کے بیٹا پہلی ہی آواز پر
چھڑ گیا حرفِ وصیت ہچکیوں کے ساز پر
نوجواں فرزند سے کہنے لگا وہ نیم جاں
الفراق اے قوتِ دل اے مری روحِ رواں
یہ خزانے یہ محل یہ جاہ یہ عزّ و وقار
سب حوالے ہیں ترے لے اے حقیقی ورثہ دار
نخلِ حسرت اک نہ اک دن باروَر ہو جائیگا
چل مرے نقشِ قدم پر تو بھی "سر" ہو جائیگا
دیکھ پھر چلتا ہے کیونکر سیم و زر کی چھاؤں میں
ڈال لے پہلے یہ زنجیرِ غلامی پاؤں میں
ہاں دکھادے کفش برداری میں سعی کامیاب
حاکمانِ وقت کے قدموں کے پیچھے بے خطاب
یاد رکھ ملت فروشی میں ترقی کا ہے راز
مصلحت ہے مولویوں سے بھی کرلے ساز باز
کر تیرے واسطے غداریاں تیرے لئے
چھوڑتا ہوں اپنی سب عیاریاں تیرے لئے
اور تو کیا وہ اگر فرمائیں میرے ہونہار
اپنی ٹھوکر سے مٹانا باپ کا نقشِ مزار

ہر ذرہ ہے نگاہوں سے اگر گر جائیگا
جس سے یہ بھر جائینگے اس سے خدا پھر جائیگا
ان کی زریں تاج کا سایہ ہے ظلِ کردگار
ہند میں قائم رکھے اللہ ان کا اقتدار
دعوتیں کر بھیج چندے غم مرا بیکار ہے
سوچ میں آقا اگر آئے تو بیڑا پار ہے
اور کہنا چاہتا تھا کچھ کہ ہچکی آ گئی
باپ پر کامل غشی، بیٹے پہ وحشت چھا گئی

☆☆

جوہر

میں شعلہ تھا — مگر یوں راکھ کے تودے نے سر کچلا
کہ اک سیلے سے پیچ و خم میں ڈھل جانا پڑا انجلو
میں بجلی تھا — مگر وہ برف آگیں بدلیاں چھائیں
کہ دب کر ان چٹانوں میں پگھل جانا پڑا انجلو

(۲)

میں طوفاں تھا — مگر کیا کیجے اس تشنہ سمندر کو
کہ سر ٹکرا کے ساحل ہی سے رُک جانا پڑا انجلو
میں آندھی تھا — مگر وہ خواب آلودہ فضا پائی
کہ خود اپنی ہی ٹھوکر کھا کے جھک جانا پڑا انجلو

(۳)

مگر اب اس کا رونا کیا ہے کیا تھا دیکھئے کیا ہوں
میں اک ٹھٹھرا ہوا شعلہ ہوں اک سکڑی ہوئی بجلی
اثر نشو و نما پر ڈال ہی دیتا ہے گہوارہ
میں اک سہما ہوا طوفاں ہوں اک سہمی ہوئی آندھی

(۴)

مگر معبود بیداری! کہیں فطرت بدلتی ہے
دھوئیں کو گرم ہونے دے بھڑکنا اب بھی آتا ہے
مری جانب سے اطمینان رکھ آتش نوا رہبر
ذرا بادل تو ٹکرائیں کڑکنا اب بھی آتا ہے

(۵)

تھپیڑے ہاں یونہی پیہم تھپیڑے موجِ آزادی
بہا دوں گا متاعِ کشتِ تکلوی بہا دوں گا
جھکولے ہاں یہی برہم جھکولے صرصرِ ہستی
ہلا دوں گا تضادِ زیست کی چولیں ہلا دوں گا

☆☆

پیتل کے کنگن

ہائے یہ پیتل کے کنگن اور تو جانِ بہار
وہ بھی لایا ہوں بمشکل وائے بر لیل و نہار
تو مگر ان کو پہن کر بھی بہت مسرور ہے
کیوں نہ ہو خاطر مرے اخلاص کی منظور ہے

--

جب سے میرے گھر میں تو آئی ہے اے مفلس نواز
بن گئی ہے ساری ہستی پیکرِ سوز و گداز
نوجواں دل میں سنائیں رنج کی گڑنے لگیں
آہ قبل از وقت رُخ پر جھریاں پڑنے لگیں
وہ گلابی انکھڑیاں وہ رس میں ڈوبے لب نہیں
میں نے جو گھونگھٹ میں دیکھے تھے وہ تیور اب نہیں
مطلعِ شادی پہ غربت کی اُداسی چھا گئی
حیف وہ گھر جس میں آکر خود شمع سنولا گئی

--

آسماں پر ہے ہوائے زر پرستی کا دماغ
بجھ رہے ہیں گھر جل سکے گھر میں غلاموں کے چراغ

--

تو پہن کر ان کو خوش رہ چھوڑ جانے دے مجھے
جنگ کے ڈنکے پہ خونی گیت گانے دے مجھے
آگ برساؤں گا آنکھوں سے جدھر جاؤں گا میں
دیو زر ... ی کا مُردہ پھونک کر آؤں گا میں

برسات کی ایک رات

یہ برسات یہ موسم شادمانی
خس و خار پر پھٹ پڑی ہے جوانی
بھڑکتا ہے رہ رہ کے سوزِ محبت
جھما جھم برستا ہے پُر شور پانی

--

فضا جھومتی ہے گھٹا جھومتی ہے
درختوں کو ضو برق کی چومتی ہے
تھرکتے ہوئے ابر کا جذب توبہ
کہ دامن اٹھائے زمیں گھومتی ہے

--

کڑکتی ہے بجلی چمکتی ہیں بوندیں
لپکتا ہے کوندا دمکتی ہیں بوندیں
رگِ جاں پہ رہ رہ کے لگتی ہیں چوٹیں
چھما چھم خلاء میں کھنکتی ہیں بوندیں

--

فلک گا رہا ہے زمیں گا رہی ہے
کلیجے میں ہر لے چُبھی جا رہی ہے
مجھے پا کے اس مست شب میں اکیلا
یہ رنگیں گھٹا تیر برسا رہی ہے

--

چمکتا ہے بجھتا ہے تھرا رہا ہے
بھٹکنے کی جگنو سزا پا رہا ہے
ابھی ذہن میں تھا یہ روشن تخیل
فضا میں جو اُڑتا چلا جا رہا ہے

--

لپک کر سنبھلتے ہیں جب ابر پارے
برستے ہیں دامن سے زردار تارے
مچلتی ہے رہ رہ کے بادل میں بجلی
گلابی ہوئے جا رہے ہیں کنارے

--

فضا جھوم کر رنگ برسا رہی ہے
ہر اک سانس شعلہ بنی جا رہی ہے
کبھی اس طرح یاد آتی نہیں تھی
وہ جس طرح اس وقت یاد آ رہی ہے

--

بھلا لطف کیا منظر پُر اثر دے
کہ اشکوں نے آنکھوں پہ ڈالے ہیں پردے
کہیں اور جا کر برس مست بادل
خدا تیرا دامن جواہر سے بھر دے

☆☆

آندھی

اُٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے — اُفق پر برق سی لہرا رہی ہے
قیامت ہر طرف منڈلا رہی ہے — زمیں بچکولے پیہم کھا رہی ہے

اُٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

مچلتی، جھومتی، ہلچل مچاتی — تڑپتی، شور کرتی، دل ہلاتی
گرجتی، چیختی، فتنے اُٹھاتی — قیامت کو جگا کر لا رہی ہے

اُٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

فضا میں آتشیں پرچم اُڑاتی — زمیں پر آگ کے دھارے گراتی
شرارے رولتی شعلے بچھاتی — سنہری روشنی پھیلا رہی ہے

اُٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

بھڑکتی آتشِ سوزاں کی صورت — لپکتی شعلۂ پرّاں کی صورت
اُبلتی بحرِ بے پایاں کی صورت — اُبل کر سر پہ آئی جا رہی ہے

اُٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

فضا کل جنگ کا میداں بنی ہے — ہوا بپھرا ہوا طوفاں بنی ہے
زمیں گہوارۂ جناں بنی ہے — فلک سے خاک سر ٹکرا رہی ہے

اُٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

بڑھی آتی ہے تعمیری تباہی — جھکی پڑتی ہے نور افزا سیاہی
جھکولے کھا رہا ہے قصرِ شاہی — ہوا زنجیرِ در کھڑکا رہی ہے

اُٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

بٹھا رکھے ہیں پہرے بیکسی نے — خزانوں کے پھٹے جاتے ہیں سینے
زمیں دہلی، اُبھر آئے دفینے — دفینوں کو ہوا ٹھکرا رہی ہے

اُٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

نشاناتِ ستم تھرا رہے ہیں — حکومت کے علم تھرا رہے ہیں
غلامی کے قدم تھرا رہے ہیں — غلامی اب وطن سے جا رہی ہے

اُٹھو، دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

☆☆

دوشیزہ مالن

لو پو پھٹی وہ چھپ گئی تاروں کی انجمن
لو جامِ مہر سے وہ چھلکنے لگی کرن
کھنچنے لگا نگاہ میں فطرت کا بانکپن
جلوے زمیں پہ برسے زمیں بن گئی دلہن
گونجے ترانے صبح کا اک شور ہو گیا
عالم مئے بقا میں شرابور ہو گیا

پھولی شفق فضا میں حنا تملا گئی
اک موجِ رنگ کانپ کے عالم پہ چھا گئی
کُل چاندنی سمٹ کے گلوں میں سما گئی
ذرّے بنے نجوم زمیں جگمگا گئی
چھوڑا سحر نے تیرگیِ شب کو کاٹ کے
اُڑنے لگی ہوا میں کرن اوس چاٹ کے

مچلی جبینِ شرق پہ اس طرح موجِ نور
لہرا کے تیرنے لگی عالم میں برقِ طور
اُڑنے لگی شمیم چھلکنے لگا سرور
کھلنے لگے شگوفے چہکنے لگے طیور
جھونکے چلے ہوا کے شجر جھومنے لگے
مستی میں پھول کانٹوں کا منہ چومنے لگے

تھم تھم کے ضوفشاں ہوا ذرّوں پہ آفتاب
چھڑکا ہوا نے سبزۂ خوابیدہ پر گلاب
مرجھائی پتّیوں میں مچلنے لگا شباب
لرزش ہوئی گلوں کو برسنے لگی شراب
رندانِ مست اور بھی سرمست ہو گئے
تھرا کے ہونٹ جام میں پیوست ہو گئے

دوشیزہ ایک خوش قد و خوش رنگ و خوبرو
مالن کی نوردیدہ گلستاں کی آبرو
مہکا رہی ہے پھولوں سے دامانِ آرزو
طفلی لئے ہے گود میں طوفانِ رنگ و بو
رنگینیوں میں کھیلی گلوں میں پلی ہوئی
نورس کلی میں قوسِ قزح ہے ڈھلی ہوئی

مستی میں رُخ پہ بال پریشاں کئے ہوئے
بادل میں شمعِ طور فروزاں کئے ہوئے
ہر سمت نقشِ پا سے چراغاں کئے ہوئے
آنچل کو بارِ گل سے گلستاں کئے ہوئے
لہرا رہی ہے بادِ سحر پاؤں چوم کے
پھرتی ہے تیتری سی غضب جھوم جھوم کے

زلفوں میں تابِ سنبل پیچاں لئے ہوئے
عارض میں شوخ رنگ گلستاں لئے ہوئے
آنکھوں میں روحِ بادۂ عرفاں لئے ہوئے
ہونٹوں میں آبِ لعل بدخشاں لئے ہوئے
فطرت نے تول تول کے چشمِ قبول میں
سارا چمن نچوڑ دیا ایک پھول میں

اے حورِ باغ، اتنی خودی سے نہ کام لے
از کرشمہ گل کہیں آنچل نہ تھام لے
کلیوں کا لے پیام سحر کا سلام لے
کیتکی سے حسنِ دوست کا تازہ کلام لے
شاعر کا دل ہے مفت میں کیوں دردمند ہو
اک گل ادھر بھی لطف اگر یہ پسند ہو

☆☆

شام

مست گھٹا منڈلائی ہوئی ہے
باغ پہ مستی چھائی ہوئی ہے
جھوم رہی ہیں آم کی شاخیں
نیند سی جیسے آئی ہوئی ہے
بولتا ہے رہ رہ کے پپیہا
برق سی اک لہرائی ہوئی ہے
لٹکے ہوئے ہیں پھول شفق کے
آتش تر چھلکائی ہوئی ہے
شعر مرے بن بن کے ہویدا
قوس کی ہر انگڑائی ہوئی ہے
رینگتے ہیں خاموش ترانے
موج ہوا بل کھائی ہوئی ہے
رونقِ عالم سر ہے جھکائے
جیسے دلہن شرمائی ہوئی ہے
گھاس پہ گم سم بیٹھا ہے کیتکی
یاد کسی کی آئی ہوئی ہے

☆☆

مشورے

پیری

"یہ آندھی، یہ طوفان، یہ تیز دھارے
کڑکتے تماشے، گرجتے نظارے
اندھیری فضا سانس لیتا سمندر
نہ ہمراہ مشعل، نہ گردوں پہ تارے
مسافر! کھڑا رہ ابھی جی کو مارے"

شباب

"اسی کا ہے ساحل اسی کے کگارے
تلاطم میں پھنس کر جو دو ہاتھ مارے
اندھیری فضا، سانس لیتا سمندر
یونہی سر پٹکتے رہیں گے یہ دھارے
کہاں تک چلے گا کنارے کنارے"

☆☆

منّتیں

عنصرِ شاعری نہ جا نغمۂ سرمدی نہ جا
چھوڑ کے مجھکو جاں بلب اے مری زندگی نہ جا
تیرا ہی عکسِ حسن ہے یہ میرے گھر کی چاندنی
اے مرے گھر کی چاندنی لے کے یہ چاندنی نہ جا
تو نے ابھی کہا تھا خود تم مجھے ہو بہت عزیز
ہاں میں تجھے عزیز ہوں رکھ لے مری خوشی نہ جا
شامِ طرب تھی بے وفا صبح سے بڑھ کے مل گئی
صبح ہے ہم پہ خندہ زن ٹھہر ٹھہر ابھی نہ جا
دیدۂ نیم باز میں خواب جواں ہے لالہ کار
نیند پکڑ رہی ہے پاؤں نیند میں جھومتی نہ جا
اُف یہ نفس کی خستگی، اُف یہ تھکا تھکا سا جی
اونگھ رہی ہیں مستیاں چور ہے زندگی نہ جا

دیکھ یہ شبنمی بہارِ نَن یہ خوش بھیرویں
ایسی لطیف صبح کو چھوڑ کے باولی نہ جا
ڈھال کے ظرفِ شعر میں باس کے عطرِ ذوق میں
تجھ پہ ابھی لٹاؤں گا دہر کی سرخوشی نہ جا
ہونٹ ترے لرز گئے رخ پہ شفق برس پڑی
اب یہ ضدیں فضول ہیں روٹھ کے اب چلی نہ جا

☆

سویرے سویرے

نہ پوچھو وہ کس طرح آ کر سدھاری
مری ساری ہستی پہ چھا کر سدھاری

وہ پچھلا پہر وہ جدائی کا لمحہ
سویرے سویرے رُلا کر سدھاری

خراماں خراماں، پشیماں پشیماں
خود اپنے سے بھی چھپ چھپا کر سدھاری

سمیٹے گئی چاندنی بام و در سے
سحر کو شبِ غم بنا کر سدھاری

نکل جائے جس طرح غنچے سے خوشبو
یونہی میرا پہلو بسا کر سدھاری

مہکتی ہوئی شب کے رنگیں زمانے
پریشاں لٹوں میں چھپا کر سدھاری

وہ پلکوں کی مستی وہ نظروں کی مستی
انہیں مستیوں میں نہا کر سدھاری

تھکی سی وہ انگڑائیاں وہ جماہی
سنبھل کر اٹھی لڑکھڑا کر سدھاری

وہ نکھری ہوئی سرو عارض کی رنگت
گلابی گلابی چلا کر سدھاری

ابھی تک مری انگلیاں کانپتی ہیں
جدھر وہ نگاہیں جھکا کر سدھاری

نظر اُٹھ ہی جاتی ہے اس سمت کیتی
کچھ اس طرح دامن بچھڑا کر سدھاری

☆

تاج

ہاں یہی تاج اسی تاج زر افشاں کی قسم
حلقۂ جبر ہے محکومیِ انساں کی قسم
شر کا عنوان ہے یہ، جنگ کی تمہید ہے یہ
تیرگی جس سے برستی ہے وہ خورشید ہے یہ
چھو کے جب اس کو ہوا جھومتی بل کھاتی ہے
خود بخود آگ ہر اک سمت بھڑک جاتی ہے
مرگِ میخانہ ہے گو رونقِ میخانہ ہے
زہر ہی زہر ہے جس میں یہ وہ پیمانہ ہے
اس کا سایہ جو کوئی شکل بنا دیتا ہے
اٹھ کے چنگیز خدائی کو ہلا دیتا ہے
سست ہے نبضِ بقا، زرد ہے روئے توحید
کہ اس آغوش میں خوابیدہ ہیں فرعون و یزید
اُف یہ تاریک چمک اُف یہ بھیانک تنویر
عکس ڈالے ہوئے ہے زار کا منحوس ضمیر
نسل و مذہب کا یہ رہتا نہیں پابند کبھی
فرق پر جس کے چمک جائے بلا کو ہے وہی
چھوٹ اسکی تن آہن پہ جو پڑ جاتی ہے
آگ اگلتی ہوئی شمشیر ابھر آتی ہے

اللہ رے! شباب کا زمانہ

ہر جنبشِ چشم والہانہ　　ہر موجِ نگاہ ساحرانہ
اللہ رے! شباب کا زمانہ

اپنی ہی ادا پہ آپ صدقے　　اپنی ہی نظر کا خود نشانہ
اللہ رے! شباب کا زمانہ

اپنے ہی سے آپ محو تمکیں　　اپنے ہی سے خود فریب کھانا
اللہ رے! شباب کا زمانہ

یہ ذوقِ نظر یہ بدگمانی　　چلمن کے قریب چھپ کے آنا
اللہ رے! شباب کا زمانہ

پلکوں میں یہ بے قرار وعدہ　　چتون میں یہ مطمئن بہانہ
اللہ رے! شباب کا زمانہ

یہ بچ کے بچا کے مشقِ غمزہ　　یہ سوچ سمجھ کے مسکرانا
اللہ رے! شباب کا زمانہ

یہ مست خرامیاں دوہائی　　ایک ایک قدم پہ لڑکھڑانا
اللہ رے! شباب کا زمانہ

ماتھے پہ یہ صندلیں تبسم　　ہونٹوں پہ یہ شکریں ترانہ
اللہ رے! شباب کا زمانہ

اس کی رونق نے اُجاڑے ہیں گلستاں لاکھوں
اس نے بستی میں بسائے ہیں بیاباں لاکھوں
کانیں چھانی ہیں پہاڑوں کے ورق موڑے ہیں
ایک ہیرے کے لئے لاکھ جگر توڑے ہیں
گھر تو گھر شمع مزاروں کی بھی بجھ جاتی ہے
جب کہیں اس کے نگینوں میں چمک آتی ہے
سیم و زر اسکے لئے لاکھ اُگلتی ہے زمیں
یہ وہ کشکولِ گدائی ہے جو بھرتا ہی نہیں
صدق کو کذب سکھاتی ہے حکومت اسکی
علم کو جہل بناتی ہے سیاست اسکی
یہ وہ جادو ہے جو ایمان پہ بھی چلتا ہے
حسبِ منشا اسی سانچے میں خدا ڈھلتا ہے
خونِ حق آکے اسی جام میں بنتا ہے شراب
جاگتی رقص کا پاجاتی ہے رنگین خطاب
اس کا طرّہ جو کبھی غیظ میں لہراتا ہے
زہرِ سقراط کے پیالہ میں چھلک جاتا ہے
زندگی اُٹھتی ہے زور اس کا مٹانے کیلئے
اور بڑھتا ہے کوئی ضرب لگانے کیلئے

☆☆

چہرے کی دمک فروغِ ایماں   زلفوں کی گرفت کافرانہ
اللہ رے! شباب کا زمانہ

احساس میں شبنمی لطافت   انفاس میں سوز شاعرانہ
اللہ رے! شباب کا زمانہ

مرقوم جبیں پہ بے خودی ہے   ایسے میں محال ہے جگانا
اللہ رے! شباب کا زمانہ

مفہوم شعار خود پرستی   معلوم نہیں ہے رحم کھانا
اللہ رے! شباب کا زمانہ

شوخی کی نظر تبسم آگیں   عشووں کا مزاج خسروانہ
اللہ رے! شباب کا زمانہ

ہاتھوں کے قریب ماہ و انجم   قدموں کے تلے شراب خانہ
اللہ رے! شباب کا زمانہ

آئینہ میں گاڑ کر نگاہیں   بے قصد کسی کا گنگنانا
اللہ رے! شباب کا زمانہ

☆☆

معذرت

یہ بکھرے سے گیسو یہ آنکھوں میں لالی   ارے حسنِ ظالم کی آشفتہ حالی
یہ روئی ہوئی پھیکی پھیکی سی آنکھیں   اور آنکھوں میں یہ نرم ڈورے گلابی
شکستہ شکستہ یہ رنگِ مسرت   چکیدہ چکیدہ یہ اشکِ زلالی
پریدہ پریدہ یہ چہرے کی رنگت   رمیدہ رمیدہ یہ رخ کی بحالی
لبِ لعل یہ مرتعش مرتعش سے   یہ کچھ سمٹی سمٹی سی ہونٹوں کی لالی
یہ کچھ بہکی بہکی سی سفاک نظریں   یہ کچھ سہمی سہمی سی فرخندہ حالی
یہ کچھ الجھے الجھے پریشاں تخیل   یہ کچھ بھٹکی بھٹکی سی روشن خیالی
یہ کچھ روٹھے روٹھے سے جذباتِ الفت   نہ شوخی، نہ عشوے نہ شیریں مقالی

مرے حسبِ وعدہ نہ آنے سے شاید   ہوئی حسرت و شوق کی پائمالی
نہ کر اب خدارا زیادہ پشیماں
کہ آخر ہوں اک شاعرِ لاابالی

☆☆

رقاصِ شرارہ

دو نگاہوں کا اچانک وہ تصادم توبہ   جھیں تکتے ہی اڑا عشق شرارا بن کر
اڑ کے پہلے انہیں جھینپی ہوئی نظروں میں رُکا   نرم، معصوم، حسیں مست اشارا بن کر
پھر تنک سے عرق آلود جبیں پہ جھلکا   پنکھڑی، پھول، گہر، جھل مل ستارا بن کر
ڈھل کے ماتھے سے اتر آیا گلِ عارض میں   رنگ، رس، شہد، حسیں ان سے بھی پیارا بن کر
گلِ عارض سے سمٹ آیا لبِ رنگیں میں   راگ، نے، لہر، شعلہ، برق کا دھارا بن کر
لبِ گلرنگ سے پھر رینگ گیا باہوں میں   لوچ، خم، جذب، مچلتا ہوا پارا بن کر
اُن کے باہوں کی گدازی میں چلا دل کی طرف   چاہ، الطاف، کرم، پیار، مدارا بن کر

دل میں ڈوبا تھا کہ بس پھوٹ پڑا رگ رگ سے
جان و دل، جامِ نظر، جانِ نظارا بن کر

پیکرِ حسن سے پھر اڑ کے چلا میری طرف   ایک بدمست جوانی کا اتارا بن کر
رہزنِ ہوش مگر ہوش کا پیغام لئے   دشمنِ ضبط مگر ضبط کا یارا بن کر
درد ہی درد مگر وجہ سکوں وجہ طرب   سوز ہی سوز مگر جان سے پیارا بن کر
آتے ہی چھا گیا کھوئی ہوئی ہستی پہ مری   مری کھوئی ہوئی ہستی کا سہارا بن کر

اب شرارہ وہی اس کے دلِ بیدار میں ہے
اور کچھ مرے تپتے ہوئے اشعار میں ہے

☆☆

کشمکش

(طبقاتی جنگ میں متوسط طبقہ کی سراسیمگی)

میرے اللہ!
میں کدھر جاؤں؟

پھر ہے فطرت نے آگ بھڑکائی   دو حریفوں میں ہے صف آرائی
اک طرف قیصری و دارائی   اک طرف مفلسی ہے تھلائی

میرے اللہ!
میں کدھر جاؤں؟

اک طرف زور ہے حکومت ہے   مال ہے، ملک ہے، سیاست ہے
اک طرف ولولے ہیں محنت ہے   شور ہے، جوش ہے، بغاوت ہے

میرے اللہ!
میں کدھر جاؤں؟

اک طرف اسلحے کھڑکتے ہیں   بیچ سے دشت و در دھڑکتے ہیں
اک طرف صرف دل بھڑکتے ہیں   جیسے آتشکدے بھڑکتے ہیں

میرے اللہ!
میں کدھر جاؤں؟

منھ کھلا ہے اُدھر خزانے کا   مڑ رہا ہے ورق زمانے کا
اور اِدھر قحط دانے دانے کا   قصد پھر بھی پہاڑ ڈھانے کا

میرے اللہ!

میں کدھر جاؤں؟

جب اُدھر کی ہوائیں آتی ہیں — دل کے ہر تار کو بجاتی ہیں
اس طرف جب نگاہیں جاتی ہیں — بجلیاں سر میں کڑکڑاتی ہیں

میرے اللہ!

میں کدھر جاؤں؟

اُن کو رحمت کا ووٹ حاصل ہے — ان میں فطرت کا زور شامل ہے
بیچ میں ہوں عجیب مشکل ہے — اک طرف آنکھ اک طرف دل ہے

میرے اللہ!

میں کدھر جاؤں؟

جذب ہونے جو اُن میں جاتا ہوں — خود کو کچھ اجنبی سا پاتا ہوں
کر کے ہمت اِدھر جو آتا ہوں — نام اجداد کا مٹاتا ہوں

میرے اللہ!

میں کدھر جاؤں؟

تو نہ دے گا اگر جواب مجھے — مار ڈالے گا اضطراب مجھے
خود نہیں سوچنے کی تاب مجھے — کھینچے لیتا ہے انقلاب مجھے

میرے اللہ!

میں کدھر جاؤں؟

☆☆

پہلا سلام

ایک چنچل جھجک ایک اُلجھا پیام
ہائے تیکھی کسی کا وہ پہلا سلام
پھول رخسار کے رسانے لگے
ہاتھ اُٹھا قدم ڈگمگانے لگے
رنگ سا خال و خد سے چھلکنے لگے
سر سے رنگین آنچل ڈھلکنے لگا
اجنبیت نگاہیں چُرانے لگی
دل دھڑکنے لگا لہر آنے لگی
سانس میں اک گلابی گرہ پڑ گئی
ہونٹ تھرّائے سہمے نظر گر گئی
رہ گیا عمر بھر کے لئے یہ حجاب
کیوں نہ سنبھلا ہوا دے سکا میں جواب
کیوں میں بے قصد و بے عزم و بے واسطہ
دوسری سمت گھبرا کے تکنے لگا

☆☆

بیکاری

یہ بازو یہ بازو کی میرے صلابت
یہ سینہ، یہ گردن، یہ قوت، یہ طاقت
یہ جوشِ جوانی، یہ طوفانِ جرأت
بہ ایں وصف کچھ بھی نہیں میری قیمت
حیات و عمل کا گنہگار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بیکار ہوں میں

یہ کھیتی ہے جس میں دفینے کئی ہیں
وہ دریا ہے جس میں گہر تہ نشیں ہیں
وہ جنگل ہیں جو رشکِ خلدِ بریں ہیں
یہ فطرت کے انعام میرے نہیں ہیں
تہی دست و محروم و نادار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بیکار ہوں میں

پکاریں زمینوں کے کانوں کے مالک
بڑھیں جگمگاتی دکانوں کے مالک
کہاں میں کہاں کارخانوں کے مالک
خریدیں چھلکتے خزانوں کے مالک
کہ محنت فروشی کو تیار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بیکار ہوں میں

جو موقع ملے سر فلک کا جھکا دوں
زمیں پر ستاروں کی شمعیں جلا دوں
خذف کو دمک دے کے سورج بنا دوں
ترقی کو کچھ اور آگے بڑھا دوں
کہ چالاک و ہشیار و بیدار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بیکار ہوں میں

ضرورت ہے میری حیات و بقا کو
ضرورت ہے میری زمیں کو فضا کو
ضرورت ہے ہر ابتدا انتہا کو
ضرورت ہے تہذیب کو ارتقا کو
غلط ہے کہ اک حرفِ تکرار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بیکار ہوں میں

کہاں زر پرستی کہاں قدر دانی
کہاں لوٹ غارت کہاں مہربانی
یہ بے آب ہستی یہ بھوکی جوانی
یہ یخ بستہ بجلی یہ استادہ پانی
رکی تیغ ہوں میں مڑی دھار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بیکار ہوں میں

مری ہڈیوں سے بنے ہیں یہ ایواں
مرے خون سے ہے یہ سیلِ بہاراں
مری مفلسی سے خزانے ہیں تاباں
مری بے زری سے ہیں سکے درخشاں
اس آئینۂ زر کا زنگار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بیکار ہوں میں

کہاں تک یہ بالجبر مر مر کے جینا
بدلنے لگا ہے عمل کا قرینا
لہو میں ہے کھولن جبیں پہ پسینا
دھڑکتی ہیں نبضیں سلگتا ہے سینا
گرج اے بغاوت کہ تیار ہوں میں
بڑا دکھ ہے مجھکو کہ بیکار ہوں میں

☆☆

لیڈر کی آمد

شور ہے چار طرف راہنما آتا ہے
مشکلیں ختم ہوئیں عقدہ کشا آتا ہے
درسِ عبرت ہے یہ ایثار زمانے کے لئے
تشنہ کاموں کی طرف ابرِ عطا آتا ہے

جھنڈیاں شہر سے لہراتی ہیں اسٹیشن تک
پھاٹکوں کی یہ سجاوٹ کہ پشیماں ہے فلک
گیس کے یہ مہِ تابندہ یہ برقی تارے
کہکشاں اتری ہے جیسے زہے تابندہ سڑک

موٹریں رینگتی ہیں ناز سے پہنے ہوئے ہار
جال پھولوں کا ہے ہر تانگہ پہ گھوڑوں پہ بہار
نشۂ فخر میں قابو سے جو باہر ہے جلوس
منہدم کرتی ہے مضبوط پولیس اپنا حصار

پارک کو دیکھ کے حیران ہے چشمِ رضواں
ایک اک خیمہ پہ فردوس کا ہوتا ہے گماں
بھاپ اڑی جاتی ہے دیگوں سے چرا کر خوشبو
اینڈتا پھرتا ہے انبوہ پہ مطبخ کا دھواں

اپنی جنت سے نکلتے بھی اگر ہیں لیڈر
جذب ہو جاتے ہیں نظروں میں یہ رنگیں منظر
اسقدر بارشِ نعمت یہ ضیا کا سیلاب
کیسے محسوس ہو تاریک ہیں بھوکوں کے کھنڈر

اس تکلف سے تو اظہار ملال اچھا ہے
کام اچھا ہی کب اس کا مآل اچھا ہے
''ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے''
(غالب)

☆☆

عورت

اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
قلبِ ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج
حسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج
جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
تیرے قدموں میں ہے فردوسِ تمدن کی بہار
تیری نظروں پہ ہے تہذیب و ترقی کا مدار
تیری آغوش ہے گہوارۂ نفس و کردار
تابہ کے گرد ترے وہم و تعین کا حصار
کوند کر مجلسِ خلوت سے نکلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
تو کہ بے جان کھلونوں سے بہل جاتی ہے
تپتی سانسوں کی حرارت سے پگھل جاتی ہے
پاؤں جس راہ میں رکھتی ہے پھسل جاتی ہے
بن کے سیماب ہر اک ظرف میں ڈھل جاتی ہے
زیست کے آہنی سانچے میں بھی ڈھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

گوشہ گوشہ میں سلگتی ہے چتا تیرے لئے
فرض کا بھیس بدلتی ہے قضا تیرے لئے
قہر ہے تیری ہر اک نرم ادا تیرے لئے
زہر ہی زہر ہے دنیا کی ہوا تیرے لئے
رت بدل ڈال اگر پھولنا پھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ کر رسم کا بت بندِ قدامت سے نکل
ضعفِ عشرت سے نکل وہمِ نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل
راہ کا خار ہی کیا گل بھی کچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ یہ عزم شکن دغدغۂ پند بھی توڑ
تیری خاطر ہے جو زنجیر وہ سوگند بھی توڑ
طوق یہ بھی ہے ''زمرد کا گلو بند'' بھی توڑ
توڑ پیمانۂ مردانِ خرد مند بھی توڑ
بن کے طوفان چھلکنا ہے ابلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تو فلاطون و ارسطو ہے تو زہرا پرویں
تیرے قبضہ میں ہے گردوں تری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اٹھا جلد اٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رکنے کا نہیں وقت بھی رکنے کا نہیں
لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

☆☆

حقیقتیں

آج ہر دن سے زیادہ ہے ہلاکت کا اثر
درد ہر رگ میں ہے دوہری ہوئی جاتی ہے کمر
یہ گرانی، یہ مرا خرچ، یہ کچھ سکۂ زر
قرض خواہوں کی ابھی سے ہوگی یورش گھر پہ
اور گھر میں غمِ عسرت کے سوا کچھ بھی نہیں

اُف یہ سکے، یہ شب و روز کی محنت کا مآل
جن کا پانا بھی وبال اور نہ پانا بھی وبال
جن کو مٹھی میں ذرا دیر ٹھہرنا ہے محال
کھینچ لیتا ہے جنہیں سود ستانوں کا جلال
حق مرا ان پہ زیارت کے سوا کچھ بھی نہیں

وہ رفیقہ، وہ مری مونسِ اخلاص پناہ
جس کی مدقوق جوانی ہے مصائب کی گواہ
دامنِ قصد تبسم میں سمیٹے ہوئے آہ
دیر سے ہوگی مرے واسطے جو چشم براہ
نذر کو اس کی ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں

پنجۂ مرگ سے ہستی کو چھڑاؤں کیونکر
ظلم کو رحم کے انداز سکھاؤں کیونکر
فرقِ زر پائے مشقت پہ جھکاؤں کیونکر
گردِ افلاس کو اکسیر بناؤں کیونکر
میرے قبضے میں تو محنت کے سوا کچھ بھی نہیں

ملکیت نے پرِ شہبازِ ہنر توڑ لئے
نخلِ فطرت کے حسیں برگ و ثمر توڑ لئے
حرص میں دامنِ گیتی کے گہر توڑ لئے
اور بس ہو تو گلِ شمس و قمر توڑ لئے
افقِ دہر پہ ظلمت کے سوا کچھ بھی نہیں

بینک، یہ بینک، یہ فردوسِ ہوس جنتِ زر
یہ چھلکتی ہوئی لبریز خزانوں کی کمر
بحر بے سیل و تلاطم کے یہ خوش آب گہر
باغِ بے خار و خزاں کے یہ طلا پوش ثمر
ہاں مری فاقہ محنت کے سوا کچھ بھی نہیں

لوٹ کے منہ پہ یہ تقسیمِ ازل کا پردا
قالبِ عدل میں ڈھالی ہوئی یہ روحِ جفا
لوحِ افلاس پہ یہ کتبۂ منشاءِ خدا
طاقِ ہستی میں یہ رکھا ہوا بت قسمت کا
اک عمل سوز سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں

راس آتا ہے جنھیں مشغلۂ جور و جفا
خونِ مفلس سے کیا کرتے ہیں جو کسبِ حنا
جن کی آنکھوں میں شرارت ہے طبیعت میں دغا
ان کی دنیا میں بھی کچھ ہے مصیبت کے سوا
میری دنیا میں مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں

گلشنِ جور کی سم ریز و خزاں پاش بہار
دوزخِ زر کے پھٹکتے ہوئے جانسوز شرار
نفع خوروں کی نگاہوں کی چمکتی تلوار
بڑھتے جاتے ہیں شب و روز کے سارے آزار
کہ علاج ان کا بغاوت کے سوا کچھ بھی نہیں

☆☆

تجربے

کام تخییل آ نہیں سکتی
دید دوری مٹا نہیں سکتی
کیف کیا بھاگتی بہاروں میں
دل کی راحت کہاں نظاروں میں
لاکھ جھولے نظر ستاروں میں
تیرگی گھر کی جا نہیں سکتی

(۲)

ذکرِ اجداد سے ہوں گو خورسند
حال و ماضی کا رابطہ تا چند
موت سے ساز کر کے جینا کیا
غم سے جو گر گئی وہ پینا کیا
وہم سے چاکِ عقل سینا کیا
ادھڑے جاتے ہیں خود بخود پیوند

(۳)

نغمگی غم پہ چھائیگی کیونکر
مفلسی مسکرائے گی کیونکر

میکدہ ہے نشاط کی بستی
پھر بھی ملتا نہیں غم ہستی
مستقل پیار عارضی مستی

روح تسکین پائے گی کیونکر

(۴)

غم ہے کی شرار پہ کتنی
آگہی ہوگی بے خبر کتنی

زلف لہرا کے عطر برسا جائے
نشہ سا اک حواس پر چھا جائے
نرم زانو پہ نیند بھی آجائے

نیند کی عمر ہی مگر کتنی

☆☆

اخفائے محبت

تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

ہائیں! یہ جبر کی صورت جینا
منہ بگاڑے ہوئے امرت پینا
کانپتی روح دھڑکتا سینا

جرم فطرت کو بناتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

دل بھی ہے دل میں تمنا بھی ہے
کچھ جوانی کا تقاضا بھی ہے
تم کو اپنے پہ بھروسہ بھی ہے

چھپ کر آنکھ ملاتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

ہاں وہ ہنستے ہیں جو انسان نہیں
جن کو کچھ عشق کا عرفان نہیں
سنگ زادوں میں ذرا جان نہیں

آنکھ ایسوں کی بچاتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

ظلم تم نے کوئی ڈھایا تو نہیں
ابنِ آدم کو ستایا تو نہیں
خوں غریبوں کا بہایا تو نہیں

یوں پسینے میں نہاتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

چھپتے تو نہیں مندر کے مکیں
چھپتے تو نہیں محراب نشیں
جھوٹ پر ان کی چمکتی ہے جبیں

سچ پہ تم سر کو جھکاتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

پردہ ہے داغ چھپانے کے لئے
شرم ہے کذب پہ چھانے کیلئے
عشق اک گیت ہے گانے کیلئے

اس کو ہونٹوں میں دباتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

آداب گھٹنے کی فرصت ہی نہیں
اور بھی کام ہیں الفت ہی نہیں
ہے یہ خامی بھی ندامت ہی نہیں

ڈر کے چلمن کو اٹھاتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

☆☆

آخری جنگ

بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم
نئے سُروں میں زندگی کے گیت گا رہے ہیں ہم
نئی زمیں پہ اک نیا جہاں بسا رہے ہیں ہم
نئے جہاں پہ اک نیا فلک بنا رہے ہیں ہم
نئے فلک پہ جھوم جھوم چھائے جا رہے ہیں ہم
بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم

تمام عرصۂ جہاں بشر کی قتل گاہ ہے
زمیں ہے زرد خوف سے فلک کا منہ سیاہ ہے
دیزہ میں خون کی نہاں عمل کی راہ ہے
حیات بے دیار ہے شباب بے پناہ ہے
بہا کے خون، خون کی تھمیں بہا رہے ہیں ہم
بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم

چراغ ہے بجھا بجھا سا منزلِ نجات کا
پڑا ہے دن کی لاش پر کفن اندھیری رات کا
اتر گیا ہے تار تار سازِ کائنات کا
سمٹ کے نقطہ بن گیا ہے دائرہ حیات کا
بڑھا کے ایک نقطہ کو طبق بنا رہے ہیں ہم
بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم

نصیحتوں سے وعظ سے کبھی رجز دبا نہیں
خروشِ رعدِ جنگ نے پیامِ حق سُنا نہیں
ہوائے گل سے آہنی حصار ٹوٹتا نہیں
شرار و برق اور تیغ، کوئی مقابلہ نہیں
قیامتیں قیامتوں کے سر پہ ڈھا رہے ہیں ہم
بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم

حیات کا یہ حکم ہے نشانِ امن گاڑ دو
بنے بنائے رہزنی کے کھیل سب بگاڑ دو
فنائے ظلم کے لئے اساسِ ظلم اُکھاڑ دو
خزاں کو جو پناہ دے وہ باغ ہی اُجاڑ دو
مع خزاں نشیمنِ خزاں جلا رہے ہیں ہم
بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم

ہمارا امتناع ہے تہی سپاہ کے لئے
ہماری تیغِ برق دم ہے فرقِ شاہ کیلئے
ہمارے زلزلے ہیں کاخِ عز و جاہ کے لئے
ہماری جست و خیز ہے کشودِ راہ کے لئے
حصار توڑتے ہیں ہم پہاڑ ڈھا رہے ہیں ہم
بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم

ہمارے قصد و عزم کے خمیر میں ثبات ہے
ظفر ہمارے گرد و پیش راس و چپ نجات ہے
ہماری پُشت آہنی پہ ارتقا کا ہات ہے
جلو میں ہیں جوانیاں رکاب میں حیات ہے
گرج کے دیوِ جنگ کا گلا دبا رہے ہیں ہم
بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم

گلوں پہ ہات ڈالکے کلائیاں مروڑ کے
چڑھی کماں اُتار کے بلند تیغ توڑ کے
عناصرِ معاشرت سے حمیّت نچوڑ کے
پکار کے اُبھار کے جھنجھوڑ کے جھنجھوڑ کے
گروہ کو گروہ سے گلے ملا رہے ہیں
بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم

جو چاند آسماں پہ تھا زمیں پہ جگمگائے گا
ستارہ دوڑ دوڑ کر قدم پہ سر جھکائے گا
تصورِ بہشت و خلد تجربہ میں آئے گا
بہار مسکرائے گی جمال گنگنائے گا
اُٹھو کہ آسمان کو زمیں پہ لا رہے ہیں ہم
بقا کو مژدۂ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم

☆☆

موجودہ جنگ اور ترقی پسند عناصر

ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں

یہ آندھی اور یہ طوفان توبہ
یہ لاشیں اور یہ میدان توبہ
بلکتے چیختے انسان توبہ
کہاں تک ہم یونہی دیکھا کرینگے   ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں

قیامت ڈھا چکی رجعت پسندی
لہو برسا چکی رجعت پسندی
سروں تک آچکی رجعت پسندی
ہٹو، اب بڑھ کے ہم حملہ کرینگے   ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں

یہ طیارے، یہ غبارے، یہ فوجیں
سرنگیں، تارپیڈو، ٹینک، توپیں
نہیں ان میں یہ طاقت ہم کو روکیں
کرینگے ان پہ ہم قبضہ کرینگے   ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں

چڑھے آتے ہیں نازی دندناتے
جلاتے پھونکتے، فتنے جگاتے
کڑکتے تلملاتے، خوں بہاتے
ہم اس یلغار کو پسپا کرینگے   ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں

ہمارے ساتھ مزدوروں کے دل ہیں
ہمارے دوست طوفانِ عمل ہیں
ہمارے ہمنوا کوہ و جبل ہیں
ہم ان کو پیس کر سرمہ کرینگے   ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں

ہمارے ساتھ ہے روسی شجاعت
ہمارے ساتھ ہے چینی حمیت
ہمارے سامنے ہے آدمیت
بہیمیت کو ہم ٹھنڈا کریں گے   ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں

ہمارے ساتھ ہندی سورما ہیں
کچھ انگلستان کے بھی باوفا ہیں
کچھ امریکہ کے بھی حق آشنا ہیں
تشدد کو تہ و بالا کریں گے   ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں

ہماری قوتوں کا پوچھنا کیا
ہماری پشت پر ہے ایک دُنیا
ہمارے ہاتھ میں ہے لال جھنڈا
یہ جھنڈا جس کو ہم اونچا کرینگے   ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں

☆☆

آخری امتحاں

بجلیاں، آگ، ٹینک، بم تو ہیں — امتحاں عزم کا ثبات کا ہے
رن یہ تیری جنگ نہیں — آخری معرکہ حیات کا ہے
یہ ترا عزم، تیری قربانی — کام اک روز آہی جائے گی
نوجوانوں کے خون کی سُرخی — روئے عالم پہ چھا ہی جائے گی
نئی دُنیا کی پڑ رہی ہے نیو — خیر اُجڑی تو اُجڑی آبادی
فیصلہ ہوگیا سرِ میداں — زندگی ہے گراں کہ آزادی
خاک میں جذب اب نہیں ہوتا — خون طوفان اب اُٹھائے گا
ہاں یہی جوش، سیل، طغیانی — آج قاتل ہی ڈوب جائے گا
ہے بدلنے پہ وقت آمادہ — خوں ترا رائیگاں نہیں ہوگا
آخری ہے یہ موت کا حملہ — اب کوئی امتحاں نہیں ہوگا

☆☆

دُھواں

یہ سیہ فام چمنی سے اُٹھتا دھواں — کارخانے کا ڈھالا ہوا آسماں
ابر کی طرح گردوں کے لب چومتا — اژدہے کی طرح اینڈتا جھومتا
لوں کی مانند دامن جھٹکتا ہوا — زہر بن کر فضا میں چھٹکتا ہوا
بجلیاں آستیں میں سنبھالے ہوئے — بوجھ سا روشِ ہستی پہ ڈالے ہوئے
گہ سمٹتا ہوا گاہ کھنچتا ہوا — انفرادی شکنجے میں بھنچتا ہوا
دیکھ کر رُخ ہواؤں کا اُڑتا ہوا — شہر و بستی کی جانب سے مڑتا ہوا
لوں سے آندھی سے بازی لگاتا ہوا — دوسری چمنیوں کو چھپاتا ہوا
یک رُخی کو فضا کی مٹائے ہوئے — وسط میں ایک دیوار اُٹھائے ہوئے

ساتھ اُڑتی ہوئی لیتے انگڑائیاں
گھڑگھڑاتی مشینوں کی پرچھائیاں

دامنِ تار پہ جابجا نقش گیر — خون مزدور کی آڑی ترچھی لکیر
نظم و ترتیب و تعمیر سے بے خبر — تند و تاریک لہروں میں طرفہ اثر

☆☆

آجروں کے لئے ابر جود و عطا — اور محنت فروشوں کو قحط و وبا
ان کی فردوس حرص و ہوس میں بہار — ان کی کشت مشقت پہ برق و شرار
ان کے قبضہ میں دیتا ہوا تخت و فوق — ان کی خاطر لئے دار و زنجیر و طوق

یہ دھواں آہ کیفی یہ اندھا دھواں
ایک مدت سے ہے جو یونہی پرفشاں
سطح سے نقطہ خودی کی ابھرے اگر — توڑ لے چاند تارے ابھی جھوم کر

ارتقاء جلوۂ نو دکھانے لگے
ہفت جنت زمیں جگمگانے لگے

☆

گلدستہ

کس درجہ حسیں یہ تحفہ ہے کس درجہ حسیں گلدستہ ہے
غمازنگاہوں سے بچکر کیفی کہ جو تو نے بھیجا ہے
خود اپنی ہی آہٹ پر تیرا اس طرح جھجکنا دیکھا ہے
ہر گل متبسم ہے اب تک ہر غنچہ ابھی تک ہنستا ہے
معصوم امانت اُلفت کی یوں پھول لئے ہیں سینے میں
جس طرح اثر موسیقی میں جس طرح جلا آئینے میں

افلاس گزیدہ شاعر یہ رنگین مشاغل کیا جانے
الفت کے گلابی پھندوں کو پابند سلاسل کیا جانے
کس طرح سجاتے ہیں گھر کو اک اُجڑا ہوا دل کیا جانے
یہ رنگ یہ نکہت کی چہلیں اک شعلوں کا حامل کیا جانے
سم ریز ہواؤں کا جھونکا جس وقت کھنڈر میں آئیگا
اے روح چمن یہ گلدستہ افسوس کہ مرجھا جائیگا

☆☆

سُرخ جنّت

(پچیسویں سالگرہ کے موقع پر)

یہ روس جس کو درندے مٹا رہے ہیں آج

یہیں جما قدم انقلاب پہلے پہل
یہیں حیات ہوئی کامیاب پہلے پہل
اُٹھا یہیں سے نیا آفتاب پہلے پہل
سیاہ ابر بھیڑیے اُڑا رہے ہیں آج

اسی زمین پہ آزاد آدمیت ہے
ہے حُسن حُسن، محبت یہیں محبت ہے
اسی بہشت میں حوا کی بادشاہت ہے
اسی بہشت پہ شیطان چھا رہے ہیں آج

یہیں حیات نے تقدیر کا صنم توڑا
یہیں فقیر کے کاسہ نے جام جم توڑا
اسی بساط پہ قارونیت نے دم توڑا
فرازنہ کیش یہیں حشر ڈھا رہے ہیں آج

جلا کے پھونک کے منحوس بندشیں ساری
دیا گیا یہیں انساں کو ذوقِ بیداری
رہ بقا سے ہوئی دور بھوک بیماری
شریر پھر وہی کانٹے بچھا رہے ہیں آج

اسی زمیں نے کسانوں کی قدر جانی ہے
اسی چمن پہ محنت کی حکمرانی ہے
یہ شاہ کی نہیں انساں کی راجدھانی ہے
اُجڑ کے خود جسے انساں بچا رہے ہیں آج

ذرا اماں جو ملی اس زمین کو شر سے
ادب کے پھول کھلے ابرِ علم کے برسے
گہر تراش لئے ارتقاء نے مخبر سے
پھر ارتقاء کو ستم آزما رہے ہیں آج

یہ سچ ہے کیسی ستم ہو رہا ہے آج اسپر
مگر وہ عکس جو ڈالے ہوئے تھا تاج اسپر
وہ پردے جو کہ اُڑھائے تھا سامراج اسپر
وہ پردے جنگ کے شعلے اٹھا رہے ہیں آج

☆☆

روسی عورت کا نعرہ

جلاتی ہوئی سیکڑوں گلستاں
چمن پر مرے پھٹ پڑی ہے خزاں
گرا کر ہر اک شاخ سے بجلیاں
اُٹھا کر ہر اک گل سے سرخ آندھیاں
خزاں کو چمن سے نکالوں گی میں
وطن صاف تجکو بچالوں گی میں

مری قوتیں رائگاں اب نہیں
حیات و عمل بدگماں اب نہیں
مرا نام کمزوریاں اب نہیں
گلے میں وہ طوقِ گراں اب نہیں
وہ طوق اب گلے میں نہ ڈالوں گی میں
وطن صاف تجکو بچالوں گی میں

مری زندگی مرکزِ غم نہیں
کسی کے قدم پر جبیں خم نہیں
میں شعلہ بھی ہوں صرف شبنم نہیں
کسی سے کسی طرح بھی کم نہیں
قدم کیسے پیچھے ہٹالوں گی میں
وطن صاف تجکو بچالوں گی میں

جو غافل تھی وہ آج بیدار ہے
جو لوری تھی وہ آج للکار ہے
جو نغمہ تھی وہ آج جھنکار ہے
جو سوئی تھی وہ آج تلوار ہے
گلے فتح کو اب لگالوں گی میں
وطن صاف تجکو بچالوں گی میں

کڑکتی ہوئی نازیت کی کماں
چمکتی ہوئی تاج کی بجلیاں
مچلتی ہوئی زر کی چنگاریاں
مٹا کر یہ سب نحس تاریکیاں
فضاؤں میں سُرخی اُچھالوں گی میں
وطن صاف تجکو بچالوں گی میں

☆☆

استالن کا فرمان

(سرخ فوجوں کے نام)

ہاں لڑے جاؤ لڑے جاؤ ابھی

آفریں زعم حریفوں کا مٹانے والو
آفریں پاؤں نہ میدان سے ہٹانے والو
آفریں عزت مزدور بڑھانے والو
وقت بیتاب ہے رُخ اپنا بدلنے کیلئے
ظلمت آمادہ ہے کچھ دیر میں ڈھلنے کیلئے
فتح بیچین ہے قدموں پہ مچلنے کیلئے
ہاں لڑے جاؤ لڑے جاؤ ابھی

نئی دُنیا نئی تہذیب کے کردار ہو تم
جنس آزادیٔ انساں کے سمجھدار ہو تم
فوج مزدور کے سردار ہو سالار ہو تم
ذہن میں بھی جو نہ تھا تم نے وہ کر دکھلایا
ہچکیاں آنے لگیں نزع میں ہے سرمایہ
لال جھنڈے کا سروں پر ہے تمہارے سایہ
ہاں لڑے جاؤ لڑے جاؤ ابھی

ہاں کر دینا ہے تمہیں مال کو دولت کو شکست
نسل کو رنگ کو رجعت کو قدامت کو شکست
ظلم کو، جور کو، نفرت کو، عداوت کو شکست
نازسی قہر کو دُنیا سے مٹانے کے لئے
دھجیاں پرچم ظلمت کی اُڑانے کے لئے
اپنے مستقبل زریں کو بچانے کے لئے
ہاں لڑے جاؤ لڑے جاؤ ابھی

عارضی فتح پہ بہکے ہوئے اترائے ہوئے
چوس کر خون تہی دستوں کا بولائے ہوئے
بھیڑیئے شہروں میں دھنس آئے تھے گھبرائے ہوئے
سرخ فوجوں سے لڑی آنکھ تو تھرانے لگے
اپنی بدعہد سیاست کی سزا پانے لگے
دیکھنا پانو اُٹھے، دیکھنا غش آنے لگے
ہاں لڑے جاؤ لڑے جاؤ ابھی

☆☆

تاج محل

دوست امیں دیکھ چکا تاج محل ــــــــــــ واپس چل

مرمریں مرمریں پھولوں سے اُبلتا ہیرا
چاند کی آنچ میں دہکے ہوئے سیمیں مینار
ذہن شاعر سے یہ کرتا ہوا چشمک پیہم
ایک ملکہ کا ضیا پوش و فضاتاب مزار
خود بخود پھر گئے نظروں میں بہ انداز سوال
وہ جو رستوں پہ پڑے رہتے ہیں لاشوں کی طرح
خشک ہو کر جو سٹ جاتے ہیں بے رس اعصاب
دھوپ میں کھوپڑیاں بجتی ہیں تاشوں کی طرح

دوست میں دیکھ چکا تاج محل ــــــــــــ واپس چل

یہ دھڑکتا ہوا گنبد میں دلِ شاہجہاں
یہ در و بام پہ ہنستا ہوا ملکہ کا شباب
جگمگاتا ہے ہر اک تہہ سے مذاقِ تفریق
اور تاریخ اڑھاتی ہے محبت کی نقاب
چاندنی اور یہ محل عالمِ حیرت کی قسم
دودھ کی نہر میں جس طرح اُبال آجائے

ایسے سیاح کی نظروں میں کھُپے کیا یہ سماں
جس کو فرہاد کی قسمت کا خیال آجائے

دوست میں دیکھ چکا تاج محل ــــــــــــ واپس چل

یہ دمکتی ہوئی چوکھٹ یہ طلاپوش کلس
انہیں جلووں نے دیا قبر پرستی کو رواج
ماہ و انجم بھی ہوئے جاتے ہیں مجبورِ نمود
واہ آرام گہِ ملکۂ معبود مزاج

دیدنی قصر نہیں دیدنی تقسیم ہے یہ
روئے ہستی پہ دھواں قبر پہ رقصِ انوار
پھیل جائے اسی روضہ کا جو سمٹا دامن
کتنے جاں دار جنازوں کو بھی مل جائے مزار

دوست میں دیکھ چکا تاج محل ــــــــــــ واپس چل

☆☆

استالین

آفریں کامریڈ استالین
ظلم کا دل ہلا دیا تو نے

خوں اُگلنے لگے ہیں باغی جور — زہر کیسا پلا دیا تو نے
اب نہیں نازیت میں وہ دم خم — سارا کس بل مٹا دیا تو نے
بڑھ رہے تھے اسی طرف وہ شریر — طوق جن کو پہنا دیا تو نے

آفریں کامریڈ استالین
قابلِ دید ہے ثبات ترا

جرأت، جوش، عزم، پامردی — ہے یہ افسانۂ حیات ترا
فتح لپٹی ہے پاؤں سے تیرے — ہات تھامے ہے خود نجات ترا
تیرے سر پر ہے انقلاب کا تاج — دوشِ تعمیر پر ہے ہات ترا

آفریں کامریڈ استالین
تجھ سا ساونت اس زمیں پہ نہیں

جنگ اور ایسے خونیوں سے جنگ — اک شکن بھی مگر جبیں پہ نہیں
اپنی دھن، اپنی راہ، اپنا کام — زنگِ اوہام کا یقیں پہ نہیں
مکر نے گندگی اچھالی خوب — چھینٹ بھی تیری آستیں پہ نہیں

آفریں کامریڈ استالین
جھک گیا ہر نشاں ترے آگے

آج مرکز ہے تو امیدوں کا — خم ہے فرقِ جہاں ترے آگے
زلزلے مضمحل قدم میں ترے — دم بخود آندھیاں ترے آگے
ارتقا، مطمئن ترے دم سے — زندگی کامراں ترے آگے

آفریں کامریڈ استالین
آدمیت کا پاسباں ہے تو

☆☆

انتباہ

مری آواز پہنچا دو یہ ایوان حکومت میں

گرجتے زلزلے چنگھاڑتے طوفان آتے ہیں
ارے ایسے میں یہ مشق ستم رانی نہیں اچھی
جہاں زندگی پر زرد خطرہ چھایا جاتا ہے
محبان وطن کے خوں کی ارزانی نہیں اچھی
نکالو جیل سے اُن کو جو خضر ملک و ملت ہیں
ان اجزائے جماعت کی پریشانی نہیں اچھی
اُجڑتے ہیں تمہارے قید خانے تو اُجڑنے دو
مگر اس وقت یہ لشکر کی ویرانی نہیں اچھی
چڑھے آتے ہیں فاشی ہند کی بھی کھولدو مشکیں
سنو کچھ وقت کی آواز من مانی نہیں اچھی

مری آواز پہنچا دو یہ ایوان تجارت میں

(۲)

وہ انساں رات دن جو چور بازاروں میں لٹتے ہیں
حدود صبر سے باہر نکل آئے تو کیا ہوگا
گوداموں میں کہاں تک نفع خوری قفل ڈالیگی
سلگتی آگ نفرت کی بھڑک جائے تو کیا ہوگا

بہت قحط و گرانی سے پریشاں ہو چکے مفلس
پریشانی بغاوت سے بدل جائے تو کیا ہوگا
فنا کرنا ہے ٹوجو کو مٹا دینا ہے ہٹلر کو
جو بھوکے شیر آپس ہی میں ٹکرائے تو کیا ہوگا
یہ موقع نفع خوری کا ہے یا خدمت گزاری کا
تمھیں سوچو لٹیرے گھر میں در آئے تو کیا ہوگا

مری آواز پہنچا دو یہ ایوان سیاست میں

(۳)

مٹا دو باہمی رنجش کہ وقت اتحاد آیا
منظم قوم کو کر دو حیات جاوداں دیدو
کہاں تک ٹھوکریں کھلوائے گی آخر یہ گمراہی
پریشاں قافلے کو اب تو منزل کا نشاں دیدو
جمود بزدلی کب تک نشاط بے حسی کب تک
ذرا ذوق عمل دیدو ذرا عزم جواں دیدو
نظام ناسنیت کو اُلٹ دینگے یہ متوالے
مقاصد کی سپر دیدو، حمیت کی سناں دیدو
نئی ترتیب دے کر فتح و نصرت کے عناصر کو
رخ قوم و وطن کو جگمگاتی سرخیاں دیدو

☆☆

اتحادیوں کے نام

نازیت کو مٹا دینے کا ہنگام آ گیا
قصرِ استبداد ڈھا دینے کا ہنگام آ گیا

توڑ دی ہے روس نے نازی لٹیروں کی کمر
بڑھ کے اب بیڑی پنہا دینے کا ہنگام آ گیا

جل چکے تیونیشیا کی فتح پر گھر کے چراغ
آگ برلن میں لگا دینے کا ہنگام آ گیا

جن پہ ہے فسطائیت کی زندگی کا انحصار
اُن زنجیروں کو جلا دینے کا ہنگام آ گیا

جاگ اُٹھی ہیں سینۂ یورپ میں جو چنگاریاں
اُن کو دامن سے ہوا دینے کا ہنگام آ گیا

ڈس چکے ہیں جن کو موذی آ چکی ہے جن کو نیند
اُن ممالک کو جگا دینے کا ہنگام آ گیا

اُن غریبوں کو بھی جو اب تک تمہارے ہیں غلام
جامِ آزادی پلا دینے کا ہنگام آ گیا

نازیت جس سے بھرے بیٹھے ہیں خود جرمن عوام
اُس کی بنیادیں ہلا دینے کا ہنگام آ گیا

پینے والے پی چکے انسان کا کافی لہو
کھولتا سیسہ پلا دینے کا ہنگام آ گیا

پال کر جن بھیڑیوں کو آج پچھتاتے ہو تم
اُن کی خوں خواری مٹا دینے کا ہنگام آ گیا

ہیں کہاں بمبار طیارے اُڑیں جلدی اُڑیں
پھونک دینے کا جلا دینے کا ہنگام آ گیا

کھول دو یورپ میں فوراً کھول دو تازہ محاذ
آ گیا طوفاں اُٹھا دینے کا ہنگام آ گیا

☆☆

جگاوا

فاشزم کا خنجر ہے کلیجوں پہ رواں دیکھ
بیداد کے ہاتھوں میں کڑکتی ہے کماں دیکھ
میدان میں انسان کے لاشے ہیں تپاں دیکھ
اُٹھ رنگِ فلک رنگ زمیں رنگِ جہاں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
بھارت کے جواں! دیکھ

روندی ہوئی دُنیا کی بہاروں پہ نظر ڈال
سلگے ہوئے ہستی کے نظاروں پہ نظر ڈال
تخریب کے سنگین شراروں پہ نظر ڈال
اٹھتا ہوا تعمیر کے سینے سے دھواں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
بھارت کے جواں! دیکھ

چنگھاڑتے عفریت کی جانسوز صدا سُن
پُرہول فضا کی سبق آموز صدا سُن
سہمی ہوئی تہذیب کی دلدوز صدا سُن
لپٹی ہوئی ہونٹوں سے تمدن کی فغاں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
بھارت کے جواں! دیکھ

مٹتے ہوئے عنوانِ بہاراں کی خبر لے
چھنتی ہوئی ہر شاخِ گل افشاں کی خبر لے
گرتی ہوئی دیوار گلستاں کی خبر لے
چھنتی ہوئی ہر پھول کے دامن سے خزاں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
بھارت کے جواں! دیکھ

شمشیر بکف جنگ کے میداں کی طرف دوڑ
آندھی کی طرح آگ کے طوفاں کی طرف دوڑ
ہاں لٹتی ہوئی عظمتِ انساں کی طرف دوڑ
ہاں مٹتا ہوا حضرتِ آدم کا نشاں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
بھارت کے جواں! دیکھ

مدہوش ہیں یارانِ وطن ان کو جگا دے
سوتے ہیں نہالانِ وطن ان کو جگا دے
غافل ہیں جوانانِ وطن ان کو جگا دے
ہے تیری طرف روحِ وطن کی نگراں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
بھارت کے جواں! دیکھ

تنظیم ہی اس وقت بچاسکتی ہے تجھ کو
تنظیم ہی جرار بناسکتی ہے تجھ کو
تنظیم ہی میدان دلاسکتی ہے تجھ کو
تنظیم کے دامن ہی میں ہے امن و اماں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
بھارت کے جواں! دیکھ

فاشزم ہے اک بدلی ہوئی شاہی کی صورت
فاشزم سے وابستہ ہے شاہی کی نحوست
فاشزم کا سرتوڑ کہ شاہی بھی ہو رخصت
اک تیر میں دو صید ذرا تیرو کماں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
بھارت کے جواں! دیکھ

ٹوجو جو ادھر آئے تو سر اس کا اڑا دے
ہٹلر جو بڑھے خاک میں ہٹلر کو ملا دے
جو چور ہیں گھر میں انہیں زندہ ہی جلا دے
ہر طوق کی جانب صفتِ برق تپاں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
بھارت کے جواں! دیکھ

☆☆

اعتراف

(نازی ایجنٹ روس میں کیوں ناکام رہے؟)

روس میں مکر کے ہم جال بچھائیں کیونکر
ناؤ کاغذ کی سمندر میں چلائیں کیونکر
رنگ اُڑتے ہوئے شعلوں پہ چڑھائیں کیونکر
پانو بجلی کے خزانے پہ جمائیں کیونکر

ہوں نہ محروم جہاں علم کی دولت سے عوام
جن کے ادراک پہ چھایا نہ ہو رنگِ اوہام
جن کو جاں سے بھی زیادہ ہو عزیز اپنا نظام
ان کو دستور غلامی کے سکھائیں کیونکر

ایسے بیدار کہ غافل کبھی ہوتے ہی نہیں
دولت علم و عمل ہاتھ سے کھوتے ہیں نہیں
ایسا لینن نے جگایا ہے کہ سوتے ہی نہیں
آہ سوتے ہی نہیں خواب دکھائیں کیونکر

استقلال

(ایک بزرگ کے نام، جو نازی درندوں کو استقلال و پامردی کا حامل سمجھتے ہیں)

تو نے استقلال کی اچھی کہی اے ہمنشیں
تجھکو شک ہے یہ پھبتی مدح بھبتی تو نہیں

پہلے اپنی دوستی کے گیت گانا بار بار
تاکہ بے روغن ہی لو دیدیں چراغ اعتبار
صلح کے پیغام سے قوموں کو بہلانے کے بعد
اندر اندر سازشوں کے جال پھیلانے کے بعد
لے کے اپنی پشت پر فوجوں کی اک سنگیں قطار
پھر انہیں قوموں پہ دھاوا بولدینا ایک بار
اور یہ ایسی شان بیہانہ یہ ایسی زعم جفا
کہ جلانا، پھونک دینا، خوں بہانا سب روا
درد انسانی، نہ اپنے عہد ہی کا کچھ خیال
لوٹ احسن، ظلم بہتر، قتل جائز، خوں حلال
مسکراتے گلستاں پر برق بنکر کوندنا
لہلہاتی کھیتیوں کو بے محابا روندنا
فخر یہ محنت کشوں کی دولتوں کو لوٹنا
دولتیں کیا عورتوں کی عصمتوں کو لوٹنا

غیر ممکن ہے کبھی دام میں آنا ان کا
ان کی راتوں کے بھی ماتھے پہ ہے پرتو دن کا
ان کے سینوں میں دھڑکتا ہے دل انسان کا
ان میں سب خضر ہیں یہ ٹھوکریں کھائیں کیونکر

اپنے آئین سے ان میں کوئی بیزار نہیں
اب یہ آزاد ہیں آزاد گرفتار نہیں
پھر وہی طوق پہن لینے کو تیار نہیں
پھر وہی طوق غلامی کے پہنائیں کیونکر

☆☆

ٹھوکروں سے توڑ دینا کھیلتے بچوں کے سر
تولنا تجھ سے پیکر آتشیں سنگین پہ

عالموں سے جاہلانہ بغض، فن کاروں سے لاگ
مدرسے ڈھانا لگا دینا کتب خانوں میں آگ

کھود کر برباد کر دینا نشانِ افتخار
شاعروں کی قبر، افسانہ نویسوں کا مزار

جادۂ تخریب پہ بے خوف چل کر یہ اکڑ
گاؤں کو، شہروں کو دوزخ میں بدل کر یہ اکڑ

سینۂ تہذیب پہ خنجر چلا کر یہ خوشی
بول ناداں! ہے یہی تعریف استقلال کی

سُن کہ استقلال جز ظلم میں آتا نہیں
تیغ کے سینہ میں یہ جوہر کسو پاتا نہیں

بھیڑیے، چیتے، درندے، چور، ڈاکو، راہزن
بس نہتوں ہی کو دکھلاتے ہیں سارا بانکپن

ہاتھ ان کے لوٹ میں تھکتے نہیں تھمتے نہیں
ہاں مقابل بھی جو ڈٹ جائے تو پھر جمتے نہیں

جانتے ہیں جس کو استقلال اہلِ علم و فن
پھوٹتی ہے مطلعِ انسانیت پہ وہ کرن

جب پلا دیتی ہے سیسہ سا صداقت پاؤں میں
مسکراتے ہیں سپاہی بجلیوں کی چھاؤں میں

شانِ استقلال تجھکو دیکھنا ہی ہے اگر
ارضِ استالن کی جانب ایک اُڑتی سی نظر

الاماں وہ لوٹ، وہ غارت، وہ فتنے الاماں
زلزلے، طوفان، ہلچل، شور، غوغا، آندھیاں

بربریت، دشمنی، سختی، جفا، نفرت، ستم
گولیاں، بارود، طیارے، سرنگیں، ٹینک، بم

مکر، حیلے، گھات، خونریزی، دغا، عیاریاں
آگ، شعلے، بجلیاں، توپیں، جہنم باریاں

جرم، وحشت، شیطنت، جادہ بہ جادہ کو بکو
جانکنی، فریاد، چیخیں، سسکیاں، لاشے لہو

جوش، حملہ، غلغلہ، یلغار، ہنگامہ، پکار
جہد، کوشش، پینترے، سٹاکیاں، حلقہ، حصار

دوڑتی چنگاریاں، گھٹتا دھواں، اُڑتے شرر
چیخے چیخے سے مکاں، سلگے ہوئے سے بام و در

ہر طرف، ہر سمت، ہر بازار، ہر بستی میں جنگ
معرکہ دوشِ ہوا پہ، دامنِ پستی میں جنگ

ہوٹلوں اسٹیشنوں میں معرکہ، راہوں میں جنگ
تھیٹروں میں، کالجوں میں، تربیت گاہوں میں جنگ

کوٹھریوں میں، گھروں میں جنگ، میدانوں میں جنگ
کارخانوں میں، دُکانوں میں، شفاخانوں میں جنگ
نازیت کی اس بلا اس سیل، اس طوفان میں
معجزہ ہیں اشتراکیت کا روسی جرأتیں
لڑ رہی ہیں سُرخ فوجیں سر ہتھیلی پر لیے
ٹوٹ کر بندھتے ہیں بندھ کر ٹوٹتے ہیں مورچے
بھاگ کر جمتے ہیں، جم کر بھاگتے ہیں سورما
جھولتا ہے آگ کے پینگوں میں میدانِ وغا
یوں لٹیروں پر جھپٹے پڑتے ہیں روسی بے خطر
آگ جیسے دوڑتی ہے کوند کر پٹرول پر

لے وہ چھوٹے جی وہ اُکھڑے پاؤں وہ ٹوٹا حصار
لے وہ چھینے اسلحے وہ بھاگ نکلے حیلہ کار
وہ پھٹے بادل دُھویں کے وہ جُھکا ظلمت کا سر
لال پرچم تلملایا وہ فضا کے دوش پر
ہاں وہ گونجی ہاں وہ چھائی فتح و آزادی کی لے
دیکھ یہ جرأت، یہ پامردی، یہ استقلال ہے

☆☆

قطعہ

(اسٹالن گراڈ کی دوبارہ تعمیر کی خبر پڑھ کر)

سنور رہی ہے نئے سرے ارضِ اسٹالین
ہنوز وقت ہے گو تیغ آزمائی کا
اُدھر تباہی و تخریب اس طرف تعمیر
یہ رُخ بھی دید کے قابل ہے اس لڑائی کا

☆☆

روسی عوام اور جنگ

یہ گلشن ہمارا ہمارا چمن ہے
ہمارے لئے خلد یہ یونین ہے
نہ وہ زار شاہی نہ وہ لوٹ غارت
ہمارا وطن اب ہمارا وطن ہے
ہم اپنے وطن کو مٹانے نہ دیں گے
قدم نازیت کو جمانے نہ دیں گے

ہمارا ہے قانون حکمت ہماری
ہمارے ہیں ایوان سیاست ہماری
ہماری ہی مہریں ہمارا ہی سکہ
ہمارے دفاتر حکومت ہماری
یہاں بربریت کو چھانے نہ دیں گے
قدم نازیت کو جمانے نہ دیں گے

یہاں محنتیں حکمراں ہیں ہماری
زمینیں جواہر فشاں ہیں ہماری
انہیں ہم نے سینچا ہے اپنے لہو سے
لہکتی ہوئی کھیتیاں ہیں ہماری
لٹیروں کو کھیتوں میں آنے نہ دیں گے
قدم نازیت کو جمانے نہ دیں گے

ثمر لا رہی ہے ریاضت ہماری
ہمارے لئے اب ہے دولت ہماری
شکنجوں سے اس کو نکالا ہے ہم نے
تجارت ہماری ہے صنعت ہماری
شکنجوں میں پھر اس کو جانے نہ دیں گے
قدم نازیت کو جمانے نہ دیں گے

یہ بن ہیں ہمارے یہ جنگل ہمارے
یہ دریا یہ وادی یہ دلدل ہمارے
ہماری ہوائیں ہماری فضائیں
یہ بجلی ہماری یہ بادل ہمارے
یہاں کوئی طوفاں اٹھانے نہ دیں گے
قدم نازیت کو جمانے نہ دیں گے

کھنڈر ہیں ہمارے، محل ہیں ہمارے
یہ نہریں ہماری جبل ہیں ہمارے
ہمارا ہی سب کچھ ہے باغِ وطن میں
شگوفے ہمارے ہیں پھل ہیں ہمارے
خزاں کو، تباہی کو آنے نہ دیں گے
قدم نازیت کو جمانے نہ دیں گے

☆☆☆

ساقی

یہ کیسی بیکسی کیسی بھیانک شام ہے ساقی
سبو سنولا گئے ہیں زرد روئے جام ہے ساقی

سکوں آور ترانے تھر تھرا کر بیٹھے جاتے ہیں
فسوں پرور مغنی لرزہ براندام ہے ساقی

چھلکتے ساغروں میں جیسے جلتے خون کی بو ہے
مستی موج مے جیسے قضا کا دام ہے ساقی

صراحی سرنگوں ہے، خم شکستہ، ساز بے نغمہ
یہ کس غارت گر عیش و طرب کا کام ہے ساقی

ذرا در کھول میخانے کا میں خود بڑھ کے دیکھوں گا
فضا میں دیر سے کیسا بپا کہرام ہے ساقی

ارے یہ تو اسی جانب بلائیں بڑھتی آتی ہیں
بلاؤں کی جلو میں ایک قتل عام ہے ساقی

اٹھا دے پینے والوں کو جگا دے سونے والوں کو
کہ اب بادہ پرستی موت کا پیغام ہے ساقی

یہ بربط توڑ، یہ مے پھینک، یہ جام و سبو لیجا
عمل کا وقت جدوجہد کا ہنگام ہے ساقی

کیا ہے بے نیاز ہوش جن کو مے کے چھینٹوں سے
انہیں بیدار کر دینا بھی تیرا کام ہے ساقی

گرانے ہی کو ہیں فاشی لٹیرے باب میخانہ
غضب ہے ہاتھ میں تیرے ابھی تک جام ہے ساقی

جسے اک روز رہزن سے کیا تھا میں نے مستی میں
اٹھا تو لا کہاں وہ تیغ خوں آشام ہے ساقی

☆☆☆

گورنر کی اسپیشل

اسپیشل ہے یہ گورنر کی درست
لیکن اسٹیشن پہ پہرا کس لئے

اک نظر آقا کو ہم بھی دیکھتے
ہم ہیں محرومِ تماشا کس لئے

کھڑکیاں کیوں بند ہیں پروردگار
تنگ ہے دامانِ جلوا کس لئے

کیوں بڑے بابو ہیں اتنے بدحواس
ہو رہا ہے زرد چہرا کس لئے

کیوں یہ سنگینیں یہ بھالے یہ پولیس
ہم غلاموں سے ہے خطرا کس لئے

قاتلوں کی بدظنی مشہور ہے
ہم سے ڈرتا ہے مسیحا کس لئے

حاکم و محکوم تو ہیں جسم و جاں
جسم و جاں میں بیر اتنا کس لئے

(۲)

دوسری گاڑی کہ جس میں ہیں عوام
اس کے انجن کو ہے سکتہ کس لئے

کیوں نہیں انجن میں آتا اُبال
سرد ہے ایک ایک پُرزا کس لئے

جا رہے ہیں کچھ سپاہی جنگ پر
ان غریبوں کو ہے روکا کس لئے

اُف وہ طفلِ بے خرد کیوں پٹ گیا
جھانک لینا جرم ٹھہرا کس لئے

کیوں اُبالے جا رہے ہیں ہم غریب
کھڑکیوں پر ہے یہ پردا کس لئے

یہ زمانِ حرب اور یہ اسپیشل
کوئلہ پھنکتا ہے اتنا کس لئے

کام شاید اب نہیں فولاد کا
ورنہ پھر یہ صرف بیجا کس لئے

آ گیا قانون کو کیسی جلال
تم نے ان بھیدوں کو پوچھا کس لئے

بیکار مزدور

(سرمایہ دار کی نظر میں)

زور ہڑتال کا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
زنگ آلات پہ چڑھتا ہی چلا جاتا ہے

الاماں شور بلکتے ہوئے مزدوروں کا
چمنیاں سرد، گراں ڈیل کلیں ہیں خاموش

زرد چہروں پہ مچلتا ہے ارادوں کا جلال
گرم نعروں سے اُبلتا ہے مقاصد کا خروش

یہ سلگتی ہوئی نظریں یہ دہکتے تیور
یہ گرجتا ہوا غصہ یہ برستا ہوا جوش

لال جھنڈے کے تلے جھومتے، بل کھاتے ہیں
گونجتے، آہنی پھاٹک پہ چڑھے آتے ہیں

(۲)

زور ہڑتال کا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
زنگ آلات پہ چڑھتا ہی چلا جاتا ہے

کارخانہ یہ ہمارا ہے ہماری ہیں یہ کلیں
ان کا حق کیا ہے خریدے ہوئے مزدور ہیں یہ

بڑھ نہ جائیں کہیں میدانِ ترقی میں حریف
یہ کہاں سوچنے کا وقت کہ رنجور ہیں یہ

گولیوں سے نہ جھجکتے ہیں نہ سنگینوں سے
اپنی تنظیم پہ، تحریک پہ مغرور ہیں یہ

گولیوں سے نہ سہی بھوک سے مارو ان کو
ان کی کھودی ہوئی قبروں میں اتارو ان کو

(۳)

زور ہڑتال کا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
زنگ آلات پہ چڑھتا ہی چلا جاتا ہے

دو نئے پاس، لکھو نام نئے، کھولو قفل
بڑھ کے تعلیم دو اخلاق کی دربانوں کو
بارہا جو اسی چوکھٹ سے گئے ہیں محروم
دو صدا پیار سے ان غمزدہ انسانوں کو
بھوکی موجوں کے تھپیڑوں سے دبے گی یہ پیل
تشنۂ گرداب نگل جائیں گے طوفانوں کو

کام ہوتے ہوئے بھی کام نہ تھا جن کے لئے
ٹھوکریں ان کو کھلائی ہیں اسی دن کے لئے

(۴)

زور ہڑتال کا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
زنگ آلات پہ چڑھتا ہی چلا جاتا ہے

جلد اب چاہئے اعلان نئی بھرتی کا
جیسے کم بختوں نے مجبور بنا رکھا ہے
جھونک دو ان کو جہنم میں بلاؤ ان کو
جن کو محرومی و غربت نے ستا رکھا ہے
اپنی محنت پہ یہ پھولے ہیں، انہیں کیا معلوم
ہم نے کتنوں کو شکنجوں میں پھنسا رکھا ہے

کل کے معتوب سزاوار اب اکرام کے ہیں
یعنی بیکار ہی مزدور بڑے کام کے ہیں

☆☆

الجھنیں

زباں کو ترجمانِ غم بناؤں کس طرح کیفی
میں برگِ گل سے انگارے اُٹھاؤں کس طرح کیفی

سمجھ میں کس کی آئے راز میرے تلملانے کا
اندھیرے میں چلا کرتا ہے ہر ناوک زمانے کا
نگاہِ مست کی اللہ رے معصوم تاکیدیں
مجھے ہے حکم سازِ مفلسی پر گنگنانے کا
میں سازِ مفلسی پر گنگناؤں کس طرح کیفی

ہنسی بھی میری نوحہ ہے، مرا نغمہ بھی ماتم ہے
جنوں بھی مجھ سے برہم ہے خرد بھی مجھ سے برہم ہے
سلگتا شوق، پگھلے ولولے، جلتی تمنائیں
زمیں میری جہنم ہے، فلک میرا جہنم ہے
خیالی جنتوں میں بیٹھ جاؤں کس طرح کیفی

یہ طوقِ بندگی، وہ پھول سی گردن معاذ اللہ
وہ شہد آلود لب اور تلخیٔ شیون معاذ اللہ
کمالِ حسن اور یہ انکسارِ عشق ارے توبہ
وہ نازک ہاتھ میرا گوشۂ دامن معاذ اللہ
جھٹک کر گوشۂ دامن چھڑاؤں کس طرح کیفی

نویدِ صبح سنتا ہی نہیں رنگین خواب اسکا
گھرا جاتا ہے ظلمت ریز کرنوں میں شباب اسکا
مجھے فرصت نہیں رنگینیوں میں ڈوب جانے کی
اُسے دیتا ہے دھوکا اعتبار انتخاب اس کا
حقیقت مست آنکھوں کو دکھاؤں کس طرح کیفی

فضا میں حزن دیدہ زندگی ضم ہوتی جاتی ہے
تھکی نبضوں کی خستہ ضرب مدھم ہوتی جاتی ہے
یہ ارمانوں کا موسم یہ مری گرتی ہوئی صحت
اندھیری رات اور لو شمع کی کم ہوتی جاتی ہے
شبستانِ وفا کو جگمگاؤں کس طرح کیفی

نرالی جست کرنا ہے نئے رستے پہ چلنا ہے
نئے شعلوں میں تپنا ہے نئے سانچے میں ڈھلنا ہے
یہی دو چار سانسیں جو ابھی مجھ کو سنبھالے ہیں
انہیں دو چار سانسوں میں زمانے کو بدلنا ہے
انہیں بھی سرد گیتوں میں گنواؤں کس طرح کیفی

پریشاں قافلے نے اب نشانِ منزل کا پایا ہے
دھندلکوں کے ادھر اک سرخ تارا جھلملایا ہے
چلے ہیں ہانپتے انساں نئی دنیا بسانے کو
بہت ایسے ہیں ان میں جنکو خود میں نے بڑھایا ہے
میں خود ہی راستے سے لوٹ آؤں کس طرح کیفی

☆☆

برما کا چاول

(سنگاپور ریڈیو سے بوس کا اعلان)

"چمن سے دور اشجارِ چمن بھجوائے جاتے ہیں
جو بھجوانے سے بچتے ہیں وہ فوجی کھائے جاتے ہیں

تمہارا دانے دانے کو ترسنا دل دکھاتا ہے
فضا پیدا کرو ہم لے کے چاول آئے جاتے ہیں"

(بھوکے بنگال کا جواب)

زمینِ ہند پر اب جال تم پھیلا نہیں سکتے
یہ مکاری کی باتیں ہیں ہم ان میں آ نہیں سکتے

وطن کو پیٹ پر قربان کرنا غیر ممکن ہے
جو غیرت دار ہیں گھر بیچ کر وہ کھا نہیں سکتے

تمہارے زہر آگیں چاولوں میں خون کی بو ہے
مبارک ہوں تمہیں ہم تاب انکی لا نہیں سکتے

گراتے ہو عبث ہم کو دکھا کر لوٹ کے دانے
تمہارے دام میں چالاک طائر آ نہیں سکتے

ہمیں ہندوستاں کے ذرہ ذرہ سے محبت ہے
یہاں تم پرچم فسطائیت لہرا نہیں سکتے

عوام اُلجھے ہیں اپنی مشکلیں خود ختم کرنے کو
یہ جھوٹے عہد و پیماں ملک کو بہکا نہیں سکتے

گداموں کے کھلیں گے قفل یہ خانوں کے
دروازے
ذخیرہ باز اب بھوکا ہمیں تڑپا نہیں سکتے

ہزاروں بجلیاں بیتاب ہیں بھوکوں کی نظروں میں
یہاں چاول تو کیا لاؤ گے تم بھی آ نہیں سکتے

☆☆

گمراہ ولی عہد؟

یہ چمن یہ کھیت یہ جنگل یہ صحرا یہ زمیں
ملکیت ہے نوعِ انساں کی یہ فتوائے یقیں
ان پہ قبضہ دیکھ کر جھکتی ہے غیرت سے جبیں
لوٹ کا اجداد کی یہ پھل ہے اور کچھ بھی نہیں
اس ستم اس لوٹ کی دل تاب لا سکتا نہیں
محترم! بارِ وراثت میں اٹھا سکتا نہیں

یہ عمارت یہ محل یہ قصر یہ دولت سرا
جو غریبوں اور کسانوں کے لہو سے ہے بنا
کتنے گھر لوٹے گئے جس دن پڑی اسکی بنا
جن کے مرنے کی نہیں جا آہ وہ بے آسرا
اس محل میں رہ کے دل آرام پا سکتا نہیں
محترم! بارِ وراثت میں اٹھا سکتا نہیں

یہ ریاست جس کا استحصال سے چلتا ہے کام
حاکمانِ وقت کی ٹھوکر میں ہے جس کا نظام
آہ جب محروم انسانوں پہ ہو جینا حرام
آہ جب روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہوں عوام
لالچی حکام کو دعوت کھلا سکتا نہیں
محترم! بارِ وراثت میں اٹھا سکتا نہیں

یہ پُرانے تذکرے یہ خاندانی اقتدار
جبر میں ڈھالی شرافت ظلم کا بالا وقار
زور پر قائم حکومت خون میں ڈوبی بہار
سوقیانہ پاک بازی تاجرانہ انکسار
اس فضا میں سونے والا گنگنا سکتا نہیں
محترم! بار وراثت میں اٹھا سکتا نہیں

اک طرف یہ رنگ رلیاں یہ امارت کی بہار
شعر و نغمہ جام و مینا سیر باغ و کوہسار
اک طرف محروم انساں مردہ دل سینہ فگار
غم گزیدہ، خستہ دیدہ، آہ برلب، اشکبار
اس تضادِ زیست کی قوت بڑھا سکتا نہیں
محترم! بار وراثت میں اٹھا سکتا نہیں

ہر طرف ادبار کے طوفان ہیں سیلاب ہیں
بھوک ہے، بیماریاں ہیں، موت کے گرداب میں
جاں بلب انساں وفورِ کرب سے بیتاب ہیں
کتنے دل مجروح کتنی انکھڑیاں پُر آب ہیں
آنسوؤں کی اس جھڑی میں مسکرا سکتا نہیں
محترم! بار وراثت میں اٹھا سکتا نہیں

اب مٹالوں گا نہ جب تک میں یہ فرسودہ نظام
مجھ پہ ہیں آرام و راحت عیش و عشرت سب حرام
میری پشتی پر ہیں مفلس میرے ساتھی ہیں عوام
اس خزانے اس حکومت اس ریاست کو سلام
اپنی خاطر فرضِ انسانی بھلا سکتا نہیں
محترم! بار وراثت میں اٹھا سکتا نہیں

☆☆

نئی صبح

یہ صحت بخش تڑکا یہ سحر کی جلوہ سامانی
افق سارا بنا جاتا ہے دامانِ چمن جیسے
چھلکتی روشنی تاریکیوں پہ چھائی جاتی ہے
اڑھائے نازیت کی لاش پر کوئی کفن جیسے
اُبلتی سُرخیوں کی زد پہ ہیں حلقے سیاہی کے
پڑی ہو آگ میں بکھری غلامی کی رسن جیسے
شفق کی چادریں رنگین فضا میں تھرتھراتی ہیں
اُڑائے لال جھنڈا اشتراکی انجمن جیسے
چلی آتی ہے شرمائی لجائی حورِ بیداری
بھرے گھر میں قدم تھم تھم کے رکھتی ہے دلہن جیسے
فضا گونجی ہوئی ہے صبح کے تازہ ترانوں سے
سرودِ فتح پہ ہیں سُرخ فوجیں نغمہ زن جیسے
ہوا کی نرم لہریں گدگداتی ہیں اُمنگوں کو
جواں جذبات سے کرتا ہو چہلیں بانکپن جیسے
یہ سادہ سادہ گردوں پہ تبسم آفریں سورج
پہ درپے کامیابی سے ہو انساں مگن جیسے
سحر کے آئینہ میں دیکھتا ہوں حسنِ مستقبل
اتر آئی ہے چشمِ شوق میں کیفی کرن جیسے

☆☆

مغالطہ

آپ کے تجربے درست آپ میں خضر دم کہاں
جادۂ زندگی کہاں تھمے ہوئے قدم کہاں
راہبری کو چھوڑئے ساتھ بھی چل سکیں گے آپ
لوچ بدن میں اب نہیں، سانچے میں ڈھل سکیں گے آپ
تند بھنور سے کھا کے بل کیسے نکل سکیں گے آپ
موج کے دوش پر قدم رکھ کے اچھل سکیں گے آپ

ابر جواں ہے زندگی سیلِ رواں ہے زندگی
جوشِ نہاں ہے زندگی برقِ تپاں ہے زندگی
موج قدم ہے زندگی جستِ کناں ہے زندگی
کل تھی کہاں ضیا فروش آج کہاں ہے زندگی

راہ نئی زمیں نئی جادہ نیا فضا نئی
فصل نئی سماں نیا دور نیا ہوا نئی
زیست کی ہر نظر نئی زیست کی ہر ادا نئی
گونج نئی تڑپ نئی جوش نیا صدا نئی

آپ تو یاد کیجئے آپ کہاں سے آئے ہیں
اپنے سلف کے نقشِ پا ٹھوکروں سے مٹائے ہیں
طاقِ حیات سے تمام ماضی کے بت گرائے ہیں
سارے قدیم مورچے توڑ دیے ہیں ڈھائے ہیں

ہے یہی حکمِ زیست کا زیست کے رازداں ہیں ہم
آپ رواں دواں تھے کل آج رواں دواں ہیں ہم
عقل جواں، عمل جواں، جوش جواں، جواں ہیں ہم
آپ کا ذہن بھی جہاں آ نہ سکا وہاں ہیں ہم

آپ نہ ہم کو روکئے آپ کی ہے صدا ضعیف
آپ کی پختگی ضعیف، آپ کا تجربہ ضعیف
آپ کی رہبری ضعیف، آپ کا راستہ ضعیف
آپ کے ذہن و دل ضعیف، آپ کے دست و پا ضعیف

یہ جو صدی ہے اپنی ہے یہ صدی آپ کی نہیں
عقل کی پختگی صحیح عقل میں تازگی نہیں
جادۂ ارتقاء ہے یہ کھیل نہیں ہنسی نہیں
کل کی پٹی ہوئی لکیر آج کے کام کی نہیں

آپ کو ہیں مغالطے عقل بڑھایئے گا کیا
آپ کی آنکھ بند ہے ہم کو جگایئے گا کیا
خود جو سبق پڑھا نہیں ہم کو پڑھایئے گا کیا
دیکھئے گرد کارواں راہ دکھایئے گا کیا

آپ کے تجربے درست آپ میں خضر دم کہاں
جادۂ زندگی کہاں تھے ہوئے قدم کہاں

☆

آخرِ شب

۱۹۴۷ء

پیش لفظ

ایک ادیب کے لئے یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لئے ہو۔ اسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہئے جو صرف ایک لمحے کے لئے ہو، اگر اس ایک لمحے میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

ایلیا اہرن برگ

ترتیب

☆۔ پیش لفظ ایلیا اہرن برگ ---------- ۱۴۷
۱۔ تجدید ---------- ۱۵۱
۲۔ توسط ---------- ۱۵۲
۳۔ تبسم ---------- ۱۵۳
۴۔ زسوں کی محافظ ---------- ۱۵۴
۵۔ نغمگی ---------- ۱۵۶
۶۔ شرم ---------- ۱۵۸
۷۔ تصور ---------- ۱۵۹
۸۔ دوراتیں ---------- ۱۶۱
۹۔ ملاقات ---------- ۱۶۲
۱۰۔ پشیمانی ---------- ۱۶۵
۱۱۔ مجبوری ---------- ۱۶۶
۱۲۔ نقش دیگر ---------- ۱۶۸
۱۳۔ اندیشے ---------- ۱۷۲
۱۴۔ نصیحت ---------- ۱۷۴
۱۵۔ احتیاط ---------- ۱۷۵
۱۶۔ منظر خلوت ---------- ۱۷۷
۱۷۔ فیصلہ ---------- ۱۸۱
۱۸۔ تلاش ---------- ۱۸۳
۱۹۔ کب تک ---------- ۱۸۴
۲۰۔ آخری مرحلہ ---------- ۱۸۵
۲۱۔ نووارد ---------- ۱۸۷
۲۲۔ تربیت ---------- ۱۹۰

۲۳۔ نئے نغمے ---------- ۱۹۳
۲۴۔ کرن ---------- ۱۹۵
۲۵۔ نئی جنت ---------- ۱۹۷
۲۶۔ ہم ---------- ۱۹۹
۲۷۔ آزادی ---------- ۲۰۲
۲۸۔ سوویت یونین اور ہندوستان ---------- ۲۰۴
۲۹۔ یلغار ---------- ۲۰۷
۳۰۔ فتح برلن ---------- ۲۱۰
۳۱۔ سلام ---------- ۲۱۵
۳۲۔ ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں ---------- ۲۱۷
۳۳۔ نئے مہربان ---------- ۲۱۹
۳۴۔ لال جھنڈا ---------- ۲۲۲
۳۵۔ بیداری ---------- ۲۲۶
۳۶۔ قومی حکمراں ---------- ۲۳۰
۳۷۔ سروجنی نائیڈو ---------- ۲۳۲
۳۸۔ حملہ ---------- ۲۳۳
۳۹۔ قومی اخبار ---------- ۲۳۸
۴۰۔ تاریکی میں ---------- ۲۴۰
۴۱۔ ناقص بھرتی ---------- ۲۴۲
۴۲۔ مثنوی ---------- ۲۴۳
۴۳۔ خانہ جنگی ---------- ۲۴۵
۴۴۔ عوام ---------- ۲۵۵

☆☆☆

تجدید

تلاطم، ولولے، ہیجان، ارماں
سب اس کے ساتھ رخصت ہو چکے تھے
یقیں تھا اب نہ ہنسنا ہے نہ رونا
کچھ اتنا ہنس چکے تھے رو چکے تھے

کسی نے آج اک انگڑائی لے کر
نظر میں ریشمی گرہیں لگا دیں
تلاطم، ولولے، ہیجان، ارماں
وہی چنگاریاں پھر مسکرا دیں

☆

۲۳۔ نئے نغمے ---------- ۱۹۳
۲۴۔ کرن ---------- ۱۹۵
۲۵۔ نئی جنت ---------- ۱۹۷
۲۶۔ ہم ---------- ۱۹۹
۲۷۔ آزادی ---------- ۲۰۲
۲۸۔ سوویت یونین اور ہندوستان ---------- ۲۰۴
۲۹۔ یلغار ---------- ۲۰۷
۳۰۔ فتح برلن ---------- ۲۱۰
۳۱۔ سلام ---------- ۲۱۵
۳۲۔ ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں ---------- ۲۱۷
۳۳۔ نئے مہربان ---------- ۲۱۹
۳۴۔ لال جھنڈا ---------- ۲۲۲
۳۵۔ سپردگی ---------- ۲۲۶
۳۶۔ قومی حکمراں ---------- ۲۳۰
۳۷۔ سروجنی نائیڈو ---------- ۲۳۲
۳۸۔ حملہ ---------- ۲۳۳
۳۹۔ قومی اخبار ---------- ۲۳۸
۴۰۔ تاریکی میں ---------- ۲۴۰
۴۱۔ ناقص بھرتی ---------- ۲۴۲
۴۲۔ مثنوی ---------- ۲۴۳
۴۳۔ خانہ جنگی ---------- ۲۴۵
۴۴۔ عوام ---------- ۲۵۵

☆☆☆

تجدید

تلاطم، ولولے، ہیجان، ارماں
سب اس کے ساتھ رخصت ہو چکے تھے
یقیں تھا اب نہ ہنستا ہے نہ روتا
کچھ اتنا ہنس چکے تھے رو چکے تھے

کسی نے آج اک انگڑائی لے کر
نظر میں ریشمی گرہیں لگا دیں
تلاطم، ولولے، ہیجان، ارماں
وہی چنگاریاں پھر مسکرا دیں

☆

نرسوں کی محافظ

جوانی اپنی گذاری ہے کس طرح تو نے
کہ اب ہر اچھی جوانی سے بدگمان ہے تو
یہ فرد جرم کسی اور کی زباں پہ نہیں
خود اپنے عہد گذشتہ کی ترجمان ہے تو

وہ چہرے جن میں فروزاں ہے عصمت مریم
تو ان پہ اپنے گناہوں کا عکس ڈالتی ہے
ترا ضمیر ہے تیرہ، مہ و نجوم نہیں
مہ و نجوم پہ تو تیرگی اچھالتی ہے

مٹا دیا ترے چہرے کی جھریوں نے جسے
تو اس نکھار کی اب تاب لا نہیں سکتی
ہنسی کو جرم سمجھنے کا یہ سبب تو نہیں
کہ اب ہنسی ترے ہونٹوں پہ آ نہیں سکتی

بٹھا دیے تو ہیں پہرے قدم قدم پہ مگر
جھجک کے چلنے میں لغزش ضرور ہوتی ہے
گناہ ہوتے ہیں داخل وہیں سے فطرت میں
جوانی اپنا جہاں اعتبار کھوتی ہے

یہ تتلیاں جنہیں مٹھی میں بھینچ رکھا ہے
جو اڑنے پائیں تو الجھیں کبھی نہ خاروں سے
تری طرح کہیں یہ بھی نہ بجھ کے رہ جائیں
تپش نچوڑ نہ ان ناچتے شراروں سے

☆

نغمگی

یہ رات کی خاموشیاں یہ 'ہائے راما' کی پکار
جیسے سکوتِ شام کی گودی میں تڑپے آبشار
کرنوں کے نشتر چھو رہے ہوں یا رگِ ابرِ بہار
تھرا اٹھے ہستی کے تار
اے بنتِ مریم گنگنا
اے جان نغمہ گائے جا

آواز تیری جس طرح جگنو چمک جائے کوئی
یا صبح کی آغوش میں غنچہ چٹک جائے کوئی
موجوں کے آئینے میں یا موتی جھلک جائے کوئی
ساغر چھلک جائے کوئی
اے بنتِ مریم گنگنا
اے جان نغمہ گائے جا

یا زیرِ دامانِ افق چھوٹی اچانک پھلجھڑی
یا دستِ ساقی کانپ اٹھا اور گلابی گر پڑی
یا اک جواں انگڑائی نے بکھرا دی موتی کی لڑی
برچھی سی دل میں آ گڑی
اے بنتِ مریم گنگنا
اے جان نغمہ گائے جا

یا بج رہی ہوں جھٹپٹے میں مندروں کی گھنٹیاں
یا منھ اندھیرے دور سے آتی ہو آوازِ اذاں
یا بند کر دے جھینپ کر خلوت کی کوئی کھڑکیاں
اور بج رہی ہوں چوڑیاں
اے بنتِ مریم گنگنا
اے روح نغمہ گائے جا

جیسے شگوفوں میں سما کر گنگناتی ہے ہوا
جیسے خلا میں رات کو گھنگھرو بجاتی ہے گھٹا
جیسے کسی دوشیزہ کے دل کے دھڑکنے کی صدا
زندہ رہے نغمہ ترا
اے بنتِ مریم گنگنا
اے جان نغمہ گائے جا

پھر ہو چلا ہے دل سبک نغموں میں دل کو تول دے
پھر تلخیٔ احساس میں آواز کا رس گھول دے
پھیلا ہے دامن دیر سے تھوڑے سے موتی رول دے
سانسوں کی گرہیں کھول دے
اے بنتِ مریم گنگنا
اے جان نغمہ گائے جا

☆

تم

شگفتگی کا لطافت کا شاہکار ہو تم
فقط بہار نہیں حاصلِ بہار ہو تم
جو ایک پھول میں ہے قید وہ گلستاں ہو
جو اک کلی میں ہے پنہاں وہ لالہ زار ہو تم
حلاوتوں کی تمنا، ملاحتوں کی مراد
غرور کلیوں کا، پھولوں کا انکسار ہو تم
جسے ترنگ میں فطرت نے گنگنایا ہے
وہ بھیرویں ہو، وہ دیپک ہو وہ ملہار ہو تم
تمھارے جسم میں خوابیدہ ہیں ہزاروں راگ
نگاہ چھیڑتی ہے جس کو وہ ستار ہو تم
جسے اٹھا نہ سکی جستجو وہ موتی ہو
جسے نہ گوندھ سکی آرزو وہ ہار ہو تم
جسے نہ بوجھ سکا عشق وہ پہیلی ہو
جسے سمجھ نہ سکا پیار بھی وہ پیار ہو تم
خدا کرے کسی دامن میں جذب ہو نہ سکیں
یہ میرے اشکِ حسیں جن سے آشکار ہو تم

☆

تصور

یہ کس طرح یاد آ رہی ہو یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
کہ جیسے سچ مچ نگاہ کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو
یہ جسمِ نازک، یہ نرم باہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو

ہزاروں جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

گلابی لب، مسکراتے عارض، جبیں کشادہ، بلند قامت
نگاہ میں بجلیوں کی جھل مل، اداؤں میں شبنمی لطافت
دھڑکتا سینہ، مہکتی سانسیں، نوا میں رس، انکھڑیوں میں امرت
ہمہ حلاوت، ہمہ ملاحت، ہمہ ترنم، ہمہ نزاکت

لچک لچک گنگنا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

تو کیا مجھے تم جلا ہی لو گی گلے سے اپنے لگا ہی لو گی
جو پھول جوڑے سے گر پڑا ہے تڑپ کے اس کو اٹھا ہی لو گی
بھڑکتے شعلوں، کڑکتی بجلی سے میرا خرمن بچا ہی لو گی
گھنیری زلفوں کی چھاؤں میں مسکرا کے مجھ کو چھپا ہی لو گی

کہ آج تک آزما رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

نہیں محبت کی کوئی قیمت جو کوئی قیمت ادا کرو گی
وفا کی فرصت نہ دے گی دنیا ہزار عزمِ وفا کرو گی
مجھے بہلنے دو رنج و غم سے سہارے کب تک دیا کرو گی
جنوں کو اتنا نہ گدگداؤ، پکڑ لوں دامن تو کیا کرو گی

قریب بڑھتی ہی آ رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

☆

دو راتیں

الجھے الجھے ہوئے جذبات نہ پوچھ
سہمی سہمی سی عنایات نہ پوچھ
بار بار اس کا کرم فرمانا
چپکے چپکے سرِ بالیں آنا
جانے کیا کیا وہ مجھے سمجھانا
اور پھر آپ ہی شرما جانا
مختصر کتنی تھی وہ رات نہ پوچھ

آہ مضمون اثر ہو کہ نہ ہو
دیکھیے رات بسر ہو کہ نہ ہو
ابر امڈے ہوئے منڈلائے ہوئے
تارے سہمے ہوئے، گھبرائے ہوئے
اشک رخسار پہ کچھ آئے ہوئے
اور کچھ پلکوں پہ تھرائے ہوئے
اب خدا جانے سحر ہو کہ نہ ہو

☆

ملاقات

کلی کا روپ، پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آج کل خزانۂ بہار لے کے آئی تھی

جبینِ تابناک میں کھلی ہوئی تھی چاندنی
وہ چاندنی میں عکسِ لالہ زار لے کے آئی تھی

تمام رات جاگنے کے بعد چشمِ مست میں
یقیں کا رس امید کا خمار لے کے آئی تھی

گلابی انکھڑیوں کی سحر کاریوں میں خندہ زن
غرورِ فتح و رنگِ اعتبار لے کے آئی تھی

وہ سادہ سادہ عارضوں کی شکریں ملاحتیں
ملاحتوں میں سرخیِ انار لے کے آئی تھی

لبِ شگفتہ و حسیں میں گدگدی شراب کی
شراب میں کھلے ہوئے شرار لے کے آئی تھی

درازِ زلف میں گندھی ہوئی تھی مالوے کی رات
سیہ لٹوں میں شامِ بادہ خوار لے کے آئی تھی

وہ قامتِ بلند جیسے بھیرویں کی مست تان
وہ لوچ جیسے موجِ جوئے بار لے کے آئی تھی

خرام جیسے پینگ لیتی ہیں نئی جوانیاں
قیام جیسے دولتِ قرار لے کے آئی تھی

مژہ مژہ پہ جگمگا رہے تھے اخترِ امید
پلک پلک پہ شامِ انتظار لے کے آئی تھی

نفس نفس میں نغمۂ مسیح کی حلاوتیں
نظر نظر میں سرمگیں وقار لے کے آئی تھی

ادا ادا میں خسروانہ بانکپن رچا ہوا
نقوشِ پا میں تاجِ شہریار لے کے آئی تھی

ہر ایک لغزشِ حسیں سلونا پن لئے ہوئے
سلونے پن میں صبحِ کوہسار لے کے آئی تھی

وہ گاتی گنگناتی نوجوانی کی خموشیاں
خموشیوں میں وقت کی پکار لے کے آئی تھی

بسنتی ساری میں چھپا ہوا سا وہ جواں بدن
جواں بدن پہ ریشمی بہار لے کے آئی تھی

وہ صندلیں کلائیاں وہ سبز و سرخ چوڑیاں
سہاگ لے کے آئی تھی سنگار لے کے آئی تھی

پسینے کی ہر ایک بوند میں تھے ضوفشاں نجوم
جبیں پہ جگنوؤں کی اک قطار لے کے آئی تھی

چہک رہی تھی قہقہوں میں ہر سنگھار کی کلی
ہنسی میں نور و رنگ کی پھوار لے کے آئی تھی
لپک رہے تھے انگڑیوں میں گلستاں ہی گلستاں
نگاہ میں بہار ہی بہار لے کے آئی تھی
مری اجاڑ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں
وہ گیسوؤں کا ابرِ عطر بار لے کے آئی تھی
جلی جلی روش کو دے رہی تھی مژدۂ نمو
تپی تپی زمیں پہ آبشار لے کے آئی تھی
اداس اداس زیست کو سنا رہی تھی بانسری
گھٹے گھٹے سکوت میں ستار لے کے آئی تھی
نگاہ و دل کا ذکر کیا تڑپ کے روح رہ گئی
کچھ اس ادا سے دعوتِ قرار لے کے آئی تھی

☆

پشیمانی

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھکو
ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن
کہ دامن پکڑ کر بٹھا لے گی مجھکو
قدم ایسے انداز سے اٹھ رہے تھے
کہ آواز دے کر بلا لے گی مجھکو

مگر اس نے روکا نہ مجھکو منایا
نہ دامن ہی پکڑا نہ مجھکو بٹھایا
نہ آواز ہی دی نہ مجھکو بلایا
میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جدا ہوگیا میں

☆

مجبوری

دوست میں دامن بچاتا کس طرح

مجھ سے شانِ جلوہ فرمائی نہ پوچھ
کس طرح وہ سامنے آئی نہ پوچھ
اس کا حسن اور اس کی رعنائی نہ پوچھ
وہ حجاب آلود انگڑائی نہ پوچھ
دل نہ قدموں پر لٹاتا کس طرح

وہ تبسم، وہ ترنم، وہ شباب
وہ نگاہیں وہ ادائیں وہ حجاب
اس کے عارض میں لپکتا ہے گلاب
اس کی آنکھوں سے برستی ہے شراب
پی کے بے خود ہو نہ جاتا کس طرح

اس کے ہونٹوں پر جب آتی ہے ہنسی
پھیل جاتی ہے فضا میں چاندنی
وہ ہے چلتی پھرتی جوہی کی کلی
وہ ہے ہنستی مسکراتی بانسری
گیت الفت کے نہ گاتا کس طرح

ڈھونڈتا تھا حسن اس کا تخت و تاج
مانگتی تھی اس کی رعنائی خراج
سوہنی کا ناز رادھا کا مزاج
چاہتی تھی کر لے میرے دل پہ راج
میں بھلا آنکھیں چراتا کس طرح

دل پہ ہنس کر تیر کھانا ہی پڑا
اس کے آگے سر جھکانا ہی پڑا
ہوش مجبوراً گنوانا ہی پڑا
ضبط کا خرمن جلانا ہی پڑا
اور جلا تو بجھاتا کس طرح
دوست میں دامن بچاتا کس طرح

☆

نقش و نگار

جاگ اٹھی ہے فطرت فن کار
اب کدھر جا رہی ہے جان بہار
تیری تصویر کھینچنا ہے مجھے
اور آہستہ اے خنک رفتار
چشم بد دور یہ قد بالا
جیسے مشرق سے صبح نو کا ابھار
ڈھل جاتی ہوئی منڈیروں پہ
دھوپ چڑھتی ہوئی سر دیوار
وقت کی گرم چٹکیوں میں تیر
حسن کے دست صندلیں میں ستار
کوئی دیوی لئے ہے ہاتھ پہ شمع
کوئی چنچل چھپا رہی ہے انار
یہ جواں جسم یہ لطیف بدن
جیسے سانچے میں ڈھل گئی ہو پھوار
خون دوڑا دیا ہے فطرت نے
گوندھ کر کچے موتیوں کا ہار

جلد کی نازکی میں خوابیدہ
چاندنی رات کا جوان خمار
خون کی گردشوں میں رقصیدہ
صبح کشمیر و شام شالامار
شاخ بلور میں اسیر دھنک
موج لرزاں میں قید عکس بہار
ہمہ تن نشۂ ہم آغوشی
ہمہ تن سرخوشی بوس و کنار
بھنچ کے کھلنے کی حسرت زندہ
کھل کے بھنچنے کی لذت جاندار
پھول سے جسم پہ سفید لباس
چاندنی اوڑھ کر کھڑی ہے بہار
تیری آنکھیں تری حسیں آنکھیں
دفعتہً تشنہ، دفعتہً سرشار
زندہ کرنے پہ دفعتہً مائل
جان لینے پہ دفعتہً تیار
مجھکو چونکا کے آپ خوابیدہ
مجھکو بے ہوش کرکے خود ہشیار

یہ ترے رس بھرے گلابی ہونٹ
سرخ، شاداب، شکریں، گلنار
انھیں ہونٹوں میں مضطرب نغمے
انھیں ہونٹوں میں منجمد جھنکار
انھیں ہونٹوں میں راز کی خنکی
انھیں ہونٹوں میں گرمیِ اظہار
انھیں ہونٹوں میں اعتراف کا شہد
انھیں ہونٹوں میں تلخیِ انکار
انھیں ہونٹوں میں لہلہاتے پھول
انھیں ہونٹوں میں مسکراتے شرار
کاش میرا نصیب بن جائیں
انھیں ہونٹوں کے پھول انھیں کے شرار
تو مجسم جمال کی دنیا
تو مجسم کمال کا بازار
تو مکمل فسانۂ گلشن
تو مکمل حدیثِ باغ و بہار

تو سراپا کمال حسن و شباب
تو سراپا طلسمِ نقش و نگار
تو نزاکت کی اولیں پہچان
تو لطافت کا آخری معیار
تیری ٹھوکر میں سیکڑوں عیدیں
تیری مٹھی میں سیکڑوں تیوہار
تو جو لچکے لچک پڑے آکاش
تو جو جھومے تو جھوم اٹھے سنسار
ذہنِ قدرت کی اولیں تخئیل
دستِ فطرت کا آخری شہ کار
روک سکتا ہے کون تجھ کو، مگر
ابھی تشنہ ہے حسرتِ دیدار
جا ترے ساتھ ساتھ جائے گی
یہ فضا یہ ہوا یہ رت یہ بہار

☆

اندیشے

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے
دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوزِ محبت کیا ہے
وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

☆☆

وہ کہاں اور کہاں کاہشِ غم، سوزشِ جاں
اس کی رنگین نظر اور نقوشِ حرماں
اس کا احساسِ لطیف اور شکستِ ارماں
طعنہ زن ایک زمانہ نظر آیا ہوگا

☆☆

جھک گئی ہوگی جواں سال امنگوں کی جبیں
مٹ گئی ہوگی للک، ڈوب گیا ہوگا یقیں
چھا گیا ہوگا دھواں، گھوم گئی ہوگی زمیں
اپنے پہلے ہی گھروندے کو جو ڈھایا ہوگا

☆☆

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پیے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر اُبھر آیا ہوگا

☆☆

اس نے گھبرا کے نظر لاکھ بچائی ہوگی
مٹ کے اک نقش نے سو شکل دکھائی ہوگی
میز سے جب مری تصویر ہٹائی ہوگی
ہر طرف مجھ کو تڑپتا ہوا پایا ہوگا

☆☆

بے محل چھیڑ پہ جذبات اُبل آئے ہوں گے
غم پشیمان تبسم میں ڈھل آئے ہوں گے
نام پر میرے جب آنسو نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہوگا

☆☆

زلف ضد کر کے کسی نے جو بنائی ہوگی
روٹھے جلووں پہ خزاں اور بھی چھائی ہوگی
برق عشووں نے کئی دن نہ گرائی ہوگی
رنگ چہرے پہ کئی روز نہ آیا ہوگا

☆☆☆

نصیحت

زندگی سے گراں جوانی ہے
رحم اپنے پہ کھائیے کتنی
دیکھ کر اب کہیں گھنا سایہ
آپ بھی بیٹھ جائیے کتنی

☆☆

جذبۂ رحم اُبھار دیتا ہے
ہے عجب چیز دورِ عشرت بھی
یاد عہدِ وفا بھی ہے تیرا
یاد رکھوں گا یہ نصیحت بھی

☆☆

احتیاط

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
مجھ سے بکھرے ہوئے گیسو نہیں دیکھے جاتے
سرخ آنکھوں کی قسم کانپتی پلکوں کی قسم
تھرتھراتے ہوئے آنسو نہیں دیکھے جاتے

☆

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
چھوٹ جانے دو جو دامانِ وفا چھوٹ گیا
کیوں یہ لغزیدہ خرامی پہ پشیماں نظری
تم نے توڑا تو نہیں رشتۂ دل ٹوٹ گیا

☆

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
میری آہوں سے یہ رخسار نہ کمہلا جائیں
ڈھونڈتی ہوگی تمھیں رس میں نہائی ہوئی رات
جاؤ کلیاں نہ کہیں سیج کی مرجھا جائیں

☆

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
میں اس اجڑے ہوئے پہلو میں بٹھا لوں نہ کہیں
لبِ شیریں کا نمک عارضِ نمکیں کی مٹھاس
اپنے ترسے ہوئے ہونٹوں میں چرا لوں نہ کہیں

☆

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
تم کو یہ رسم بھی دنیا نہ نبھانے دے گی
بڑھ کے دامن سے لپٹ جائے گی یوں تازہ بہار
میری آغوشِ تصور میں نہ آنے دے گی

☆☆

منظرِ خلوت

ایک بیوہ سر بسر تصویرِ درد
دل شکستہ، رُخ کی رنگت زرد زرد
مضمحل سے خال و خد تیور ملول
سرد پیشانی نگوں عارض کے پھول
رُخ پہ داغِ قلب کی پرچھائیاں
سوگ میں ڈوبی ہوئی رعنائیاں
حسن کی سحر آفرینی بے اثر
ست رو بے کار سے تیرِ نظر
پیکرِ گل میں خزاں اُتری ہوئی
مست ابرو کی کماں اُتری ہوئی
نوجوانی میں ضعیف و ناتواں
برف میں ڈھالی ہوئی بجلیاں
زندگی پر موت منڈلائی ہوئی
شمعِ بزمِ طور کجلائی ہوئی
مفلسی کی صید، غربت کی شکار
روز کے فاقوں سے بے جان و نزار

لے کے دل میں جوششِ طوفانِ یاس
آئی اک دن ایک مولانا کے پاس
آ کے یوں کہنے لگی وہ سوگوار
اے وحیدِ عصر، فخرِ روزگار
آپ کو اللہ عمرِ خضر دے
کوکبِ اقبال تابندہ رہے
مٹ رہی ہوں مٹ رہی ہوں المدد
دیجئے مجھ کو غریبی کی سند
تاکہ ہو دنیا کو میرا اعتبار
اور بڑھ جائے گدائی کا وقار
رحم کھانا مجھ پہ ہوجائے ثواب
کچھ سنبھل جائے مرا حالِ خراب
مجھ کو اپنا غم نہیں کچھ زینہار
ہاں مرا معصوم عابد ہے نزار
میرے غم خانے کی ہے تنویر وہ
ہو بہ ہو ہے باپ کی تصویر وہ
میرے جینے کا سہارا ہے وہی
دل کا سکھ، آنکھوں کا تارا ہے وہی

مجھ کو ڈر ہے باپ اس معصوم کا
خلد میں مجھ سے نہ ہوجائے خفا
روزِ بد ایسا نہ اب قسمت دکھائے
مجھ سے وہ آنکھوں کا تارا چھن ہی جائے
زندگی کی نبض دھیمی ہو نہ جائے
اس کو احساسِ یتیمی ہو نہ جائے
عیش کے سانچے میں غم ڈھل جائے گا
آپ کے صدقے میں وہ پل جائے گا
مولوی صاحب کہ تھے اُستادِ کید
دیکھ کر آیا ہوا پنجے میں صید
پونچھ کر عینک کا شیشہ مسکرائے
مسکرائے، تھرتھرائے، تلملائے
سُرمہ گوں آنکھوں میں لالی آ گئی
روئے زیبا پہ بحالی آ گئی
زُہد کا لبریز پیمانہ ہوا
انگلیوں سے ریش میں شانہ ہوا
عارضی عصمت کو لے ڈوبی ہوس
خود بخود بجنے لگے تارِ نفس

تھر تھرا کر ہونٹ نیلے ہو گئے
پیچ عمامے کے ڈھیلے ہو گئے
پھول کر سینہ سوا ہونے لگا
تنگ ہر ہو قبا ہونے لگا
تیوریوں میں سر ریا ڈھلنے لگی
آستینوں کو دغا چھلنے لگی
پاکبازی سر جھکا کر رہ گئی
پارسائی تلملا کر رہ گئی
ظاہری معصومیت چکرا گئی
جسم نازک میں پھریری آ گئی
تف ہے تجھ پر تف ہے زہد مظلہ خو
لوٹ لی اک بے زباں کی آبرو

۱۹۳۳ء

☆

فیصلہ

قدم رات کے ڈگمگاتے نہیں   ہمارے کنول مسکراتے نہیں
کبھی راہ منزل کی پاتے نہیں   لہو سے جو مشعل جلاتے نہیں

شرر حسرت کے بھڑکنے لگے   بیاباں میں گلشن لچکنے لگے
ہزاروں خذف بھی چمکنے لگے   ستارے یہاں جگمگاتے نہیں

غلامی سے سب گرم پیکار ہیں   یہاں خانہ جنگی کے آثار ہیں
ابھی اپنے دامن میں کچھ تار ہیں   ابھی طوق پر ہاتھ جاتے نہیں

بڑی آرزو تھی بڑی آس تھی   کہا تھا کہ ہم پھر ملیں گے کبھی
ذرا پوچھتا لیڈروں سے کوئی   وہ وعدے تمھیں یاد آتے نہیں

نہ جوش عمل ہے نہ سوز یقیں   بدلتی ہے خوابوں سے قسمت کہیں
اُٹھتے ہیں اپنوں پہ جو آستیں   وہ دشمن سے آنکھیں ملاتے نہیں

نگاہوں میں پوشیدہ ہے اضطراب
تڑپتے ہیں اپنی حدوں میں جناب
جھلکتا ہے چہروں سے سوزِ عتاب
بہم ہو کے طوفاں اٹھاتے نہیں

نگاہوں میں ارجن کا ہے تیر بھی
بایں شان گردن میں زنجیر بھی
ہے قبضے میں ٹیپو کی شمشیر بھی
مرقعے یہ اب دیکھے جاتے نہیں

بدلتا چلا جا رہا ہے جہاں
قدم خود بڑھاتا ہے اب کارواں
جھجکنے، ٹھٹکنے کی فرصت کہاں
اگر راہبر راہ پاتے نہیں

☆

۴۵ء

تلاش

(قلعہ احمد نگر جہاں کانگریسی رہنما نظر بند تھے)

یہ بجھی سی شام، یہ سہمی ہوئی پرچھائیاں
خونِ دل بھی اس فضا میں رنگ بھر سکتا نہیں
آ اتر آ کانپتے ہونٹوں پہ اے مایوس آہ
سقفِ زنداں پہ کوئی پرواز کر سکتا نہیں
جھلملائے میری پلکوں پہ مہ و خور بھی تو کیا؟
اس اندھیرے گھر میں اک تارا اتر سکتا نہیں

لوٹ لی ظلمت نے روئے ہند کی تابندگی
رات کے کاندھے پہ سر رکھ کر ستارے سو گئے
وہ بھیانک آندھیاں، وہ ابتری، وہ خلفشار
کارواں بے راہ ہو نکلا، مسافر کھو گئے
ہیں اسی ایوان بے در میں یقیناً رہنما
آ کے کیوں دیوار تک نقشِ قدم گم ہو گئے

دیکھ اے جوشِ عمل وہ سقف، یہ دیوار ہے
ایک روزن کھول دینا بھی کوئی دشوار ہے

☆

کب تک

اک سپاہی کو پنھادی گئی آخر زنجیر
ہے تو بیداد مگر یہ نئی بیداد نہیں
اسی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں کتنے رشید
نام بھی جن کا ہمیں پوری طرح یاد نہیں

چڑھ کے پھانسی پہ اتر آیا ہے سہگل صد شکر
کتنے سہگل اسی پھانسی پہ مگر جھول گئے
ان شہیدوں کا تھا ہر قطرۂ خوں شاہنواز
رفتہ رفتہ جنھیں ارباب وطن بھول گئے

جانے ہم رحم کی درخواست کریں گے کب تک
کب تک آئین کی محتاط مذمت ہوگی
ایک اک نام پہ کہرام مچے گا کب تک
کب تک اس طرح بالاقساط بغاوت ہوگی

☆

آخری مرحلہ

حصار باندھے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے
کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اٹھائے ہوئے
بڑھے ہیں جھیلے ہوئے قید و بند کے آزار
اٹھے ہیں جنگِ خلافت کے آزمائے ہوئے
شجاع حیدر و ٹیپو کی گود کے پالے
دلیر نانک و رنجیت کے سکھائے ہوئے
خمار بادۂ اقبال کا نگاہوں میں
لبوں پہ نغمۂ ٹیگور مسکرائے ہوئے
نفس میں آنچ گرجتی ہوئی مشینوں کی
قدم پہ آتش و آہن کا سر جھکائے ہوئے
جبیں پہ دھان کے کھیتوں کی نرم ہریالی
نظر میں قحط کی پرچھائیاں چھپائے ہوئے
بھڑک کے دوش ہوا پہ بکھر رہے ہیں کمند
شرر جو سرد کتابوں میں تھے دبائے ہوئے
فضا میں سرخ پھریرا لٹا رہا ہے حیات
ہوا کی زد پہ چراغ عمل جلائے ہوئے

تڑپ کے گرنے ہی والی ہے برق زنداں پر
کھڑے ہیں در پہ اسیر آسرا لگائے ہوئے

ابھی کھلیں گے نہ پرچم ابھی پڑے گا نہ رن
کہ مشتعل ہے مگر متحد نہیں ہے وطن
پکارتا ہے افق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رسن
یہ انتشار، یہ ہل چل، یہ مورچوں میں شگاف
مذاق اڑاتے ہیں عزم جہاد کا دشمن
نکل کے صف سے کھڑے ہو گئے ہیں کچھ سادات
بڑھا کے ہاتھ محبت سے تھام لو دامن
پھر ایک بار بڑھو لے کے صلح کا پیغام
پھر ایک بار جلا دو شکوک کے خرمن
یہ یاس کیوں؟ یہ تمنائے خودکشی کیسی؟
نوید فتح ہے قلب عوام کی دھڑکن
مٹا دو مل کے مٹا دو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

☆

مژدہ

"حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک؟
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک"
زوال ملّت اسلامیہ کے نوحہ خواں شبلی
مبارک ہو کہ کروٹ لے رہا ہے آسماں شبلی
مٹائے گا ہمارا کون اب نام و نشاں شبلی
دھواں گرما چکا اڑنے کو ہیں چنگاریاں شبلی

"پریشاں ہو گئے شیرازۂ اوراق اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک؟"
یقیناً موت کا پیغام ہے تنظیم کی خامی
بجا بھی تو دیا کرتا ہے اکثر درد ناکامی
اکٹھا ہو رہے ہیں منتشر اوراق اسلامی
تھپیں گی قصر سلطانی میں اب یہ آندھیاں شبلی

"کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ حشر انگیزیاں تا کے یہ ظلم آرائیاں کب تک"
ہمارے خون سے دامان گلستاں ہو چلا رنگیں
خزاں کے دام میں جکڑے پڑے ہیں سنگ دل گلچیں
خوشا تہذیب انسانی کے استادوں کو لے ڈوبیں
وہ حشر انگیزیاں شبلی وہ ظلم آرائیاں شبلی

"یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک"
لیا ہے یہ سبق ہم نے خود اپنے خوں شدہ دل سے
ستم کی خو بدل سکتی نہیں فریاد بسمل سے
تڑپ کر چھین لیں گے تیغ ہم اب دست قاتل سے
ہماری گردنوں پر اب نہ ہوگا امتحاں شبلی

"یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم مگر ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک"
افق پر کروٹیں لینے لگا جمہور کا پرچم
نئے سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہے عرصۂ عالم
ہمارے ہمدموں سے جن کی محفل ہو چلی برہم
وہ کیا دیکھیں گے اب ہنگامۂ آہ و فغاں شبلی

"یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں اپنے درد دل کی تم کو داستاں کب تک"
وہ گل شعلہ بنے جن پر ستم کروٹ بدلتا تھا
وہ رات آخر ہوئی جس میں چراغ ظلم جلتا تھا
ہمارا قصۂ غم سن کے جن کا جی بہلتا تھا
قریب ختم آ پہونچی انھیں کی داستاں شبلی

☆

تربیت

''کانگرس برباد'' تو نے کیا کہا اے ننگِ غدار
آ گیا جیسے اچانک ہاتھ میں بجلی کا تار
کم سنی بھی درس غداری کا پڑھتی ہے کہیں
بولتی ہے روح تیرے باپ کی یہ تو نہیں
جانتا ہوں تو ہے تھانے دار کا لختِ جگر
گونجتا رہتا ہے ہر دم ایسے ہی نعروں سے گھر
نام سنتی ہیں جو اک تشویشناک انداز میں
لیڈروں کو کوستی ہیں ہاتھ اٹھا کر عورتیں
منتیں منتی ہیں ترویجِ جفا کے واسطے
نذر چڑھتی ہے غلامی کی بقا کے واسطے
بام و در پہ چھاؤنی چھائے ہے خانہ سازِ قہر
بس چکا ہے سنگدل اینٹوں میں غداری کا زہر
گوشہ گوشہ گونجتا ہے لوٹ کی جھنکار سے
جھانکتی ہیں رشوتیں ہر روزنِ دیوار سے
لو دیا کرتے ہیں شب میں سینۂ ملت کے داغ
خونِ مفلس سے جلا کرتا ہے ڈیوڑھی کا چراغ

ایسا اک محور، عمل ہے تیرے بوڑھے باپ کا
چاک جس پر گھومتا رہتا ہے ہر دم پاپ کا
جو ہے حامی رہزنی کا جو ہے شب خوں کا معین
جس کے بل پر گھڑگھڑاتی ہے حکومت کی مشین
جو ہے نوکر جرأتوں کو ٹوکنے کے واسطے
لکھنے والوں کا تڑپنا روکنے کے واسطے
آہنی دیوار ہے جو تند پانی کے لیے
بادباں ہے جو جہازِ حکمرانی کے لیے
جس کی ہستی سے ہے قائم رشتۂ دار و رسن
جس کے بوتے پہ خدائی کر رہا ہے اہرمن
جس کی وردی میں بھیانک آندھیاں پوشیدہ ہیں
جس کی پگڑی میں طلائی اژدہے پیچیدہ ہیں
جس کی مقراضِ نظر جیبوں پہ جب کرتی ہے چوٹ
بوکھلا جاتے ہیں سکے بلبلا اٹھتے ہیں نوٹ
اس سیہ آغوش میں تو پل رہا ہے ہائے ہائے
ظرفِ غداری میں بچپن ڈھل رہا ہے ہائے ہائے
سن کے اب جاگی ہوئی تحریک سو سکتی نہیں
جو سہولت باپ کو تھی تجھ کو ہو سکتی نہیں

لٹنے ہی والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ
لگنے ہی والی ہے جیلوں، دفتروں، تھانوں میں آگ
مٹنے ہی والا ہے خون آشام دیو زر کا راج
آنے ہی والا ہے ٹھوکر میں الٹ کر سر سے تاج
چھننے ہی والی ہے ظلمت رہنے ہی والا ہے نور
ہلنے ہی والی ہیں قبریں پھنکنے ہی والا ہے صور
کھلنے ہی والے ہیں پرچم پڑنے ہی والا ہے رن
لٹنے ہی والے ہیں گلشن کھلنے ہی والے ہیں بن
بہنے ہی والا ہے ایوانِ شہنشاہی میں خون
چھٹنے ہی والی ہے چھت گرنے ہی والے ہیں ستون
آنے ہی والا ہے سقفِ نو پہ رنگیں آفتاب
گڑنے ہی والا ہے دنیا میں نشانِ انقلاب
اک نئے سانچے میں ڈھل جائے گی ساری کائنات
تیری خاطر تنگ ہو جائے گا دامانِ حیات

ورنہ مستقبل کی خاطر ربطِ ماضی توڑ دے
باپ کے نقشِ قدم پر پاؤں رکھنا چھوڑ دے

☆

۱۹۴۳ء

نئے خاکے

(گاندھی جناح ملاقات کے موقع پر)

نقوشِ حسرت مٹا کے اٹھنا، خوشی کا پرچم اڑا کے اٹھنا
ملا کر سر بیٹھنا مبارک ترانۂ فتح گا کے اٹھنا
یہ گفتگو گفتگو نہیں ہے بگڑنے بننے کا مرحلہ ہے
دھڑک رہا ہے فضا کا سینہ کہ زندگی کا معاملہ ہے
خزاں رہے یا بہار آئے تمھارے ہاتھوں میں فیصلہ ہے
نہ چین بے تاب بجلیوں کو نہ مطمئن کاروانِ شبنم
کبھی شگوفوں کے گرم تیور کبھی گلوں کا مزاج برہم
شگوفہ و گل کے اس تصادم میں گلستاں بن گیا جہنم
سجا لیں سب اپنی اپنی جنت اب ایسے خاکے بنا کے اٹھنا
خزانۂ رنگ و نور تاریک رہگزاروں میں لٹ رہا ہے
عروسِ گل کا غرورِ عصمت سیاہ کاروں میں لٹ رہا ہے
تمام سرمایۂ لطافت ذلیل خاروں میں لٹ رہا ہے
گھٹی گھٹی ہیں نمو کی سانسیں چھٹی چھٹی نبضِ گلستاں ہے
ہیں گرد پھول، تشنہ غنچے، رخوں پہ زردی، لبوں پہ جاں ہے
اسیر ہیں ہم صفیر جب سے خزاں چمن میں رواں دواں ہے
اس انتشارِ چمن کی سوگند بابِ زنداں ہلا کے اٹھنا

حیاتِ گیتی کی آج بدلی ہوئی نگاہیں ہیں انقلابی
افق سے کرنیں اتر رہی ہیں بکھیرتی نور کامیابی
نئی سحر جاگتی ہے خوابوں کی بزم میں اذنِ باریابی

یہ تیرگی کا ہجوم کب تک یہ یاس کا اژدہام کب تک
نفاق و غفلت کے آڑ لے کر جئے گا مردہ نظام کب تک
رہیں گے ہندی اسیر کب تک رہے گا بھارت غلام کب تک
گلے کا طوق آ رہے قدم پر کچھ اس طرح تلملا کے اٹھنا

☆

ستمبر ۱۹۴۴ء

کرن

(گاندھی جناح ملاقات)

مطمئن کوئی نفس اے دلِ رنجور نہیں
اب الگ بیٹھ کے جی لینے کا مقدور نہیں
تجربوں نے وہ لگائے ہیں دلوں میں چرکے
روٹھے مل جائیں گلے آج تو کچھ دور نہیں
زندگی صلح پہ مجبور ہوئی جاتی ہے

رخِ سم آلودہ ہواؤں کا بدلنے سا لگا
شوقِ پژمردہ عناصر میں مچلنے سا لگا
کس نے یہ سازِ اخوت پہ الاپا دیپک
اک دیا رات کی آغوش میں جلنے سا لگا
تیرگی یاس کی کافور ہوئی جاتی ہے

خار کیا چیز ہیں دو دوست جو ملنا چاہیں
سوزِ رفتار سے لو دینے لگی ہیں راہیں
وقت نے سینۂ احساس میں لے لی چٹکی
ڈال دیں گرم تقاضوں نے گلے میں بانہیں
آخری شرط بھی منظور ہوئی جاتی ہے

مل گئیں اُٹھ کے نگاہیں جو نگہبانوں کی
نبض اُبھر آئی سسکتے ہوئے ارمانوں کی
ناخدا جوڑ کے سر بیٹھنے والے ہیں اِدھر
اور اُدھر سانس اُکھڑنے لگی طوفانوں کی
موج کشتی کے تلے چور ہوئی جاتی ہے

☆

۱۵؍اگست ۱۹۴۳ء

نئی جنت

نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے
تڑپ دے کر خس و خاشاک کو بجلی بنائیں گے
کوئی آواز دے دے آتش افشاں چاند تاروں کو
کہ اب خاکِ وطن کے جھلسے ذرّے جگمگائیں گے
اداسی مسکرائے گی بیاباں لہلہائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

الٹ کر ایک ٹھوکر میں ستم کا راج رکھ دیں گے
اٹھا کر اپنی پستی کو سرِ معراج رکھ دیں گے
وہ اک گل کی حکومت تھی کہ گلشن لٹ گیا سارا
ہم اب کے غنچے غنچے کی جبیں پر تاج رکھ دیں گے
ہم اب کے تنکے تنکے کو چمن بندی سکھائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

دور جستجو میں کیسے اپنے کیسے بیگانے
گھلے رہتے ہیں باہم شمعِ آزادی کے پروانے
گرہ لگنے سے اکثر رشتۂ دل ٹوٹ جاتا ہے
الگ ہو کر رہیں گے متحد تسبیح کے دانے
شکنجے توڑ دو متوالے ہنس کر مل ہی جائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

اٹھایا زندگی نے گنگنا کر وہ رباب اپنا
حقیقت سے گلے ملنے کو ہے رنگیں خواب اپنا
یہ زنگ آلودہ مہریں جلد اے پیرِ مغاں لے جا
خُم اپنے ہوں گے، ساغر اپنے ذوقِ انتخاب اپنا
جنھیں چاہیں گے اُن کو میر میخانہ بنائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے

☆

ستمبر ۱۹۴۴ء

ہم

حکمت کا نغمہ، شعر کی انگڑائیاں ہیں ہم
غنچوں کے ترجمان، گلوں کی زباں ہیں ہم
ایک اک نفس میں بوئے وطن ہے بسی ہوئی
نبضِ وطن میں خون کی صورت رواں ہیں ہم
تاجِ ہمالیہ، دلِ ہندوستاں ہیں ہم

نقش و نگار و رنگ کے گلشن کھلا دیے
سنگ و خزف پہ لعل و زمرد لٹا دیے
جو کانپتے تھے روئے تمدن پہ بار بار
وہ خواب ہم نے تاج محل میں کھپا دیے
مژدہ دیارِ تاج کے رشکِ جہاں ہیں ہم

آہوں کو رقص، غم کو چہکنا سکھا دیا
گیتوں کو دل کی آنچ میں بجلی بنا دیا
سوگندِ گرم لے کی قسم تان سین کی
ہر محفلِ نشاط میں دیپک جلا دیا
وہ سوزِ یار و سحر اثر نغمہ خواں ہیں ہم

بے شک ہماری حُبِ وطن پر فضول ہے
ہم کو دیارِ ہند کا کانٹا بھی پھول ہے
گیدڑ کی بے حیائی سے جینا نہیں پسند
شیروں کی آن بان سے مرنا قبول ہے
ٹیپو کے لب سے ٹوٹی ہوئی بجلیاں ہیں ہم

اٹھ کر نگاہِ وقت کی تڑپا گئی جنہیں
لیلائے حریت کی ادا بھا گئی جنہیں
جو اپنے خوں سے رنگ گئے پرچمِ وطن
دار و رسن کی سیج پہ نیند آ گئی جنہیں
اُن سو بلا شہیدوں کا خوابِ جواں ہیں ہم

ہر لفظ میں ہے جنگِ خلافت کا ہمہمہ
ہر حرف میں ہے سوزِ نظر بندِ مالٹا
سرخی ملی ہے جس کو شہیدوں کے خون کی
ہے جس کا ایک باب کراچی کا معرکہ
قربانی و جہاد کی وہ داستاں ہیں ہم

اسلاف نے اُڑائے تھے جو رزم گاہ میں
ہم نے اُٹھالئے ہیں وہ شعلے نگاہ میں
بے شک بچھڑ گئے تھے کبھی کارواں سے ہم
بے شک دبے پڑے تھے کبھی گردِ راہ میں
اے ہم رکاب اب جرسِ کارواں ہیں ہم

کھائی قدم قدم پہ جو ٹھوکر سنبھل گئے
اک جست کر کے یاس کی حد سے نکل گئے
بچھڑی کی جو کھل کے سبز پھریرے نے تازگی
بکھرے خذف ہلال کے سانچے میں ڈھل گئے
اب آفتاب بن کے اُفق پر رواں ہیں ہم

صیاد کی قفس کی نحوست مٹائیں گے
کانٹوں کو گدگدا کے تبسم سکھائیں گے
خط اس غرض سے کھینچ رہے ہیں زمین پر
ان زرد وادیوں کو گلستاں بنائیں گے
مصروف زینتِ چمن و آشیاں ہیں ہم

☆

آزادی

جبیں سے نور برساتی
چلی آتی ہے آزادی
مچلتی، جھومتی، گاتی
چلی آتی ہے آزادی

یہ سیلِ آتش و آہن یہ بحرِ خوں کی طغیانی
فضا کی نبض برہم، وقت کے انداز طوفانی
غلامی کا سفینہ گھومتا ہے ڈگمگاتا ہے
جواں موجیں لیے دامن میں ساحل مسکراتا ہے
جواں موجوں پہ بل کھاتی
چلی آتی ہے آزادی

اُٹھے ہیں تُند طوفاں جھوم کر زخمی حبابوں سے
ہوا کاندھا ملا کر چل رہی ہے انقلابوں سے
جمود و خامشی کی تہ میں ہنگامے مچلتے ہیں
ہلا کر کوہساروں کی جڑیں تیشے اُبلتے ہیں
چٹانیں توڑتی ڈھاتی
چلی آتی ہے آزادی

جو خونخواری میں یکتا تھا وہ اپنے خوں میں غلطاں ہے
لبِ سرمایہ داری آخری ہچکی سے لرزاں ہے
گلے ملتی ہے فتح و کامرانی نوجوانی سے
پُرانے بُت گرے جاتے ہیں طاقِ زندگانی سے
در و دیوار دہلاتی
چلی آتی ہے آزادی

سنبھالا آخری بھی لے لیا بیمار دنیا نے
ہوئے جاتے ہیں اپنے بوجھ سے شل ظلم کے شانے
تڑپ کر تو گرفتاروں نے زنداں توڑ ڈالے ہیں
اسیرانِ کہن کے طوق گل کر کرنے والے ہیں
کچھ ایسی آگ بھڑکاتی
چلی آتی ہے آزادی

نظر میں بجلیاں دل میں تڑپ سانسوں میں ہل چل ہے
لبوں پر فتح کا مژدہ جبیں پر سرخ آنچل ہے
جو بڑھ کر تھام لے دامن جواں عشوے اسی کے ہیں
الٹ دے بڑھ کے جو گھونگھٹ حسیں جلوے اسی کے ہیں
نگاہ و دل کو تڑپاتی
چلی آتی ہے آزادی

☆

۱۹۴۳ء

سوویت یونین اور ہندوستان

ہندوستان

تو دوست سارے زمانے کا ہے کلام نہیں
مگر زبان پہ ہندوستاں کا نام نہیں
انھوں نے بھی مری مرضی پہ لکھ دیے دو حرف
بلند عزم نہیں جن کا فیض عام نہیں
میں تیرا دوست تو میرے دکھوں سے بیگانہ
خطا معاف یہ کیا رنج کا مقام نہیں

سوویت یونین

یہ وہم چھوڑ کہ تجھ کو بھلا دیا ہم نے
مگر دعا کو عمل میں چھپا دیا ہم نے
زباں پہ حرف نہ گن بازوؤں کا کس بل دیکھ
نظام جبر و تشدد مٹا دیا ہم نے

نگاہ چاہیے منزل کو ڈھونڈنے کے لئے
چراغ راہ گذر میں جلا دیا ہم نے
لب مسیح کی جنبش کا انتظار نہ کر
علاج درد غلامی بتا دیا ہم نے
نگاہ لطف و کرم طنز ہے غلامی پہ
خود اپنا طوق گلا کر دکھا دیا ہم نے
نوید دید کے طالب مذاق دید بڑھا
رخ حیات سے پردہ اٹھا دیا ہم نے
وہ گیت تیر گیا ہے ضمیر آدم میں
جو انقلاب کی دھن میں سنا دیا ہم نے
سیاہ رات کے سینے پہ جڑ دیے تارے
ملول صبح کو ہنسنا سکھا دیا ہم نے
جو خواب قید تھا فردوس کے تصور میں
اسے زمیں کا مقدر بنادیا ہم نے
بڑھے تھے تیری ہی کشتی کی سمت یہ طوفاں
لہو میں ڈوب کے جن کو دبا دیا ہم نے

یہ وہم! اور تری زندگی پہ چھائے ہوئے؟
وہ دیکھ پائے غلامی ہیں لڑکھڑائے ہوئے
ترا چراغ شہیدوں کے خوں سے روشن ہے
تری حیات کے پہلو ہیں جگمگائے ہوئے
تجھے پکار رہا ہے وہ تیرا مستقبل
نظر میں پھول جبیں پہ چمن کھلائے ہوئے
تڑپ کے ڈال دے گردن میں پیار سے بانہیں
عروسِ فتح کھڑی ہے نقاب اٹھائے ہوئے

"بس اتحاد ہے اب سخت امتحاں تیرا
اور اس کے بعد زمیں تیری آسماں تیرا"

☆

نومبر ۴۴ء

یلغار

جست، کڑکے جیسے برق کوہسار
غیظ، گرجے شب میں جیسے آبشار
جوش، اُمڈے جس طرح ابرِ بہار
ہل کے طوفاں کا کلیجہ رہ گیا
سرپٹک کے تند دھارا رہ گیا
ہانپ کر رستے میں دریا رہ گیا
شہر میں بل کھا رہی ہے سُرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سُرخ فوج

بن گیا طوفان زر دیا کا لہو
لوٹتے ہیں اپنے خوں میں فتنہ جو
کامراں ہے روس دنیا سرخ رو
مٹ رہا ہے ظلم کا نام و نشاں
اڑ رہی ہیں نازیت کی دھجیاں
اٹھ رہا ہے قلبِ وحشت سے دھواں
بجلیاں برسا رہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج

ہوگیا تھا شل فراست کا دماغ
بجھ گیا تھا قصرِ ہستی کا چراغ
مٹ گیا تھا شعر و موسیقی کا باغ

جم گیا تھا ساز کی نبضوں میں خوں
دم بخود تھا علم ، حکمت سرنگوں
چھا گیا تھا آدمیت پر جنوں

اب جنوں پر چھا رہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج

صبح کی پڑنے لگیں پرچھائیاں
پھٹ پڑیں آفاق پر رعنائیاں
ارتقا لینے لگا انگڑائیاں

مضمحل لمحوں میں جاں آنے لگی
وقت جھوما زندگی گانے لگی
ظلمتوں میں صبح لہرانے لگی

نور یوں جھلکا رہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج

مسکرایا، گنگنایا عہدِ نو
دے اٹھی دل کی فسردہ شمع لَو
جاگ اٹھی سینوں میں آزادی کی رو

اب یہ دھارا رخ بدل سکتا نہیں
سامراج اب پھول پھل سکتا نہیں
قصرِ لعنت اب سنبھل سکتا نہیں

قصرِ لعنت ڈھا رہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج

فروری ۴۵ء

☆

فتحِ برلن

خنجروں کی باڑھ، تیغوں کی روانی ختم ہے
رہزنی ، غارت گری، ایذا رسانی ختم ہے
آندھیوں کی، زلزلوں کی قہر مانی ختم ہے
زندگی پر حادثوں کی حکمرانی ختم ہے
ڈھل گئی شب، صبحِ عشرت کا پیام آہی گیا
آفتابِ ماسکو بالائے بام آہی گیا

فتح کا شعلہ لپک کر پھول برسانے لگا
سُرخ پرچم سینۂ برلن پہ لہرانے لگا
ذرہ ذرہ مست ہوکر رقص فرمانے لگا
چہچہا اُٹھی فضا، سارا جہاں گانے لگا
پھینک کر فاشزم کا بارِ نحوست شان سے
آج لی دنیا نے پوری سانس اطمینان سے

خار و خس کو تھی ہوس بڑھ کر گلِ تر توڑ لیں
جاں بہ لب مورو ملخ شاہیں کا شہپر توڑ لیں
کھوکھلی تاریکیاں اور ماہ و اختر توڑ لیں

سنگ پارے دامنِ دریا سے گوہر توڑ لیں
روند کر دشمن کی کشتی اور دریا بڑھ گیا
جرمنی پر والگا کا سرخ پانی چڑھ گیا

ارتقا کی راہ میں سوجال پھیلائے گئے
سو جہنم گھات میں جنت کی بھڑکائے گئے
کتنے پتھر ساغرِ ہستی پہ برسائے گئے
جتنے بادل سامنے خورشید کے آئے گئے
دب گئی آندھی بھی گھٹ کر رہ گیا طوفان بھی
لے لیا محنت کشوں نے آج کا میدان بھی

ہاں مبارک ہو انھیں یہ کامیابی یہ خوشی
بخش دی جن منچلوں نے زندگی کو زندگی
ان شہیدوں کو خبر کردے کوئی اس عید کی
جن کی گاتی گنگناتی نوجوانی لٹ گئی
دہر میں بجتا ہے ڈنکا آج ان کے نام کا
سوگئے جو موڑ کر رخ گردشِ ایام کا

ہاں مبارک ہو انھیں یہ کامرانی، یہ بہار
کردیا فاشزم کا پرچم جنھوں نے تار تار
ان دلیروں کے گلے میں ڈال دو پھولوں کے ہار
بڑھ گیا جن کے عمل سے آدمیت کا وقار
اے عروسِ دہر کھل کر گنگنالے جھوم لے
روح کیتی بڑھ کے استالن کے بازو چوم لے

کھیتیوں کو، خرمنوں کو گلستانوں کو سلام
تج دیا سب کچھ جنھوں نے ان کسانوں کو سلام
ٹینکوں، گولوں، جہازوں، یادہاتوں کو سلام
جن میں بم ڈھالے گئے ان کارخانوں کو سلام
اب کبھی ناکامیوں کا زخم بھر سکتا نہیں
اس طرح کچلا گیا فتنہ ابھر سکتا نہیں

کہہ دو جھومیں باغ و صحرا، گنگنائیں آبشار
اب نہ لہرائیں گے شعلے اب نہ برسیں گے شرار
مٹ گیا نازی لٹیروں کا دو روزہ اقتدار
دوڑ جا جھلسے ہوئے کھیتوں پہ اے رنگِ بہار

ساتھ اپنے فتنہ گر فتنوں کی دنیا لے گئے
جو شگوفوں کو کچلتے تھے، کچل ڈالے گئے

کہہ دو دھو ڈالیں وہ مائیں مسکرا کر دل کے داغ
جل گئے تھے جن کے خرمن لٹ گئے تھے جن کے باغ
کہہ دو اب اٹھ کر جلائیں دیویاں گھی کے چراغ
مٹ گئے جو توڑتے پھرتے تھے عصمت کے ایاغ
زندگی پائے اجل پر جبہہ سائی کرچکی
اہرمن کی نسل دنیا پر خدائی کرچکی

کہہ دو اہلِ علم پھر ذوقِ نظر پیدا کریں
پھر ادب کے پھول، حکمت کے گہر پیدا کریں
تیرگی کے بطن سے نورِ سحر پیدا کریں
خامشی سے نغمے، نغموں سے شرر پیدا کریں
جن کو چڑھتی تھی علم و حکمت سے ادب سے، راگ سے
ہوگئے ٹھنڈے الجھ کر زندگی کی آگ سے

کہہ دو گونج اُٹھے ترانوں سے دلِ ارض و سما
کہہ دو اُترے چاندنی، دمکے فضا، مہکے ہوا
جگمگا اے روئے تہذیب و تمدن جگمگا
رقص کر اے روحِ مستقبل، تھرک اے ارتقا
جشن یہ خدا کا ہے اور عید یہ آدم کی ہے
کارنامہ روس کا ہے فتح اک عالم کی ہے

کہہ دو چھلکے، کہہ دو برسے مست آنکھوں سے شراب
لہلہائیں عارضوں کے پھول، ہاتھوں کے گلاب
آج سے آتش نوا کیفی اٹھائے گا رباب
مسکرائے حسن، گائے عشق، جاگ اُٹھے شباب
مضطرب شاعر بھی عنوانِ طرب پا ہی گیا
کم سے کم آج ایک پہلو تو قرار آ ہی گیا

☆

مئی ۴۵ء

سلام

میں کلکتے میں کیفی آج پہلی بار آیا ہوں
مچلتی آرزو، بے تاب دل سینے میں لایا ہوں
سلام اس شہر پر جس کی فضا میں گیت بستے ہیں
جہاں نذرل کے اور ٹیگور کے نغمے برستے ہیں
سلام اس خاک پر گودی سے جس کی آفتاب اٹھا
بغاوت نے کماں کڑکائی شورِ انقلاب اٹھا
سلام اس دیس کے اُن انقلابی نوجوانوں کو
بسا رکھا ہے مدت سے جنھوں نے جیلخانوں کو
سلام اُن شہریوں، اُن کامگاروں، ان کسانوں پر
وبا و قحط نے حملہ کیا تھا جن کی جانوں پر
سلام اُن پر غذا چوروں نے در در جن کو دوڑایا
جنھوں نے پانی روٹی اور نہ مرنے پر کفن پایا

سلام اُن اسٹرائیک کرنے والے کامگاروں کو
لہو پینے نہیں دیتے جواب سرمایہ داروں کو
سلام اُن نوجوانوں کو سلام اُن بے گناہوں کو
پلایا خونِ ناحق جن کا جلادوں نے راہوں کو
نہ بھولیں گی نومبر کی وہ خونیں داستاں برسوں
کرے گا ناز کلکتے پہ کُل ہندستاں برسوں
سلام اُس دن پہ جب غیرت نے یوں چھیڑا دلیروں کو
کوئی بے چین کردے جس طرح خوابیدہ شیروں کو
اُٹھے ہندو مسلماں ساتھ ہی جوشِ جہاد ایسا
لہو بھی مل گیا دونوں کا بہہ کر اتحاد ایسا
اس اک جنتی میں جانے کس کی کس کی موت پنہاں تھی
خفا کچھ رہنما بھی تھے، حکومت بھی پریشاں تھی
وہ منظر کاش خوابِ قوم کی تعبیر بن جاتا
وہ وقتی اتحاد اس ملک کی تقدیر بن جاتا

☆

جنوری ۴۶ء

ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں

سلام اے روس! تیرے شعلے عجب شگوفے کھلا رہے ہیں
جلا چکی تھی خزاں جنھیں وہ خزاں کا دامن جلا رہے ہیں
تری دہکتی ہوئی جبیں سے گری ہیں جتنی دہکتی بوندیں
چراغ اتنے ہی سرحدِ انقلاب پر جھلملا رہے ہیں
یہ تیری ہی جست کی دھمک ہے جو آج دیواریں ڈھ گئی ہیں
نشاں ہیں یہ تیرے ہی قدم کے جو راستے جگمگا رہے ہیں
اُڑائے ہیں بار بار شعلے جو سامراجی نجومیوں نے
وہ سرخ جنت سے دُور ٹھنڈی فضاؤں میں تھرتھرا رہے ہیں
بساط ہی جب اُلٹ گئی ہو تو کیسی گھاتیں کہاں کی چالیں
ہر ایک رخ سے پرانے عیار مات پر مات کھا رہے ہیں
حیات نے دو صفوں میں دنیا کو آج تقسیم کر دیا ہے
نئی طرح لُٹنے، لوٹنے والے قوتیں آزما رہے ہیں
اُدھر فریب اس طرف صداقت، وہاں تشدد یہاں بغاوت
وہ راہ میں بو رہے ہیں کانٹے ہم اُن پہ بجلی گرا رہے ہیں

شمال کیسا، جنوب کیسا، کہاں کا مغرب کہاں کا مشرق
جہاں جہاں ہیں غریب و مظلوم ایک پرچم اڑا رہے ہیں
ہمارے جادے، ہماری منزل، ہمارے دریا، ہمارے ساحل
ہماری دنیا بسی ہوئی ہے جدھر نگاہیں اٹھا رہے ہیں
ہمارے مل اور کارخانے، ہماری کھیتی ہماری کانیں
ہماری قوت کو پوچھنا کیا ہم آج دنیا پہ چھا رہے ہیں
ہمارے انجن ہماری ریلیں ہماری بھاپ اور ہماری بجلی
زمیں پہ مہریں لگا رہے ہیں فضا میں سکے چلا رہے ہیں
ہزار پہلو سے لڑ رہے ہیں ہم اپنی یہ آخری لڑائی
ہزار رخ سے ہم اپنے دشمن پہ ضرب آخر لگا رہے ہیں
ہر ایک شہر اور ہر ایک بستی میں ہر جزیرے میں ہر گڑھے میں
نئی صفیں ہم نے باندھ لی ہیں نئے پرے ہم جما رہے ہیں
کہیں زمیں چھینے لے رہے ہیں نکل پڑے ہیں کہیں ملوں سے
کہیں بغاوت کی آگ بھڑکا کے راج محلوں کو ڈھا رہے ہیں
نہ روک سکتی ہے خانہ جنگی نہ ٹوک سکتے ہیں سست رہبر
ہم انقلابی ہیں انقلابی ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں

☆

نئے مہربان

بے سمجھے دل کا حال ترس کھا رہے ہیں آپ
کس درجہ مہربان نظر آ رہے ہیں آپ
ہم بد نصیب قدر کرم جانتے نہیں
دعویٰ بغیر جہد و عمل مانتے نہیں
اس اہتمام راہ نمائی کا شکریہ
ہم تو مگر حضور کو پہچانتے نہیں
کس انجمن سے اٹھ کے چلے آ رہے ہیں آپ

اب تک کہاں تھے آپ نگاہیں ملائیے
بند نقاب کھولئے صورت دکھائیے
آنکھوں میں نور چہروں پہ سکوں کی چاندنی
یہ کس کا خوں ہے کس کا اجالا بتائیے
جلوہ دکھا کے ہم سے چھپے جا رہے ہیں آپ

ہے ذوقِ دید کب سے اسی پیچ و تاب میں
خورشید ہے کہ برق چھپی ہے نقاب میں
"مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں"
کیا چیز اتنے پیار سے چھلکا رہے ہیں آپ

ماضی کے تجربوں کو بھلایا نہ جائے گا
ہم سے فریبِ جان کے کھایا نہ جائے گا
ہوجائے اپنی گرد میں گم قافلہ جہاں
اس سمت اک قدم بھی اٹھایا نہ جائے گا
کس راستے پہ ہم کو لئے جارہے ہیں آپ

طوفاں بھی، جھوم جھوم کے آندھی بھی آئی ہے
اک شمع کتنے جھونکوں سے ہم نے بچائی ہے
وہ ابتری وہ بے سروپائی وہ خلفشار
سو مشکلوں کے بعد ابھی صف جمائی ہے
پھر انتشار بزم میں پھیلا رہے ہیں آپ

ذوقِ عمل ہی جاگ گیا ہے تو آیئے
یہ سازِ انقلاب ہے کچھ گنگنایئے
کاندھے پہ رکھ کے سرخ علم آن بان سے
ہر سمت اتحاد کا پرچم اُڑایئے
کیوں راہ سخت دیکھ کے کترا رہے ہیں آپ

بے چارگیِ زیست پہ ہے موت خندہ زن
روٹی تو کیا غریبوں کو ملتا نہیں کفن
بکتے ہیں جسم ہوتی ہیں نیلام عصمتیں
پھرتی ہے بال کھولے ہوئے غیرتِ وطن
اُٹھئے کہ بس ہمیں پہ ترس کھا رہے ہیں آپ

اس وقت بھی جو خوئے نفاق آپ چھوڑتے
مل جل کے آفتوں کی کلائی مروڑتے
لاتے انھیں منا کے جو روٹھے ہیں دیر سے
ٹوٹے ہوئے دلوں کو محبت سے جوڑتے
جھلا کے اور شیشوں کو ٹکرا رہے ہیں آپ

مئی ۲۵ء

☆

لال جھنڈا

''لال جھنڈا پھینک دو'' اے دیش بھگتو کیا کہا
یہ تو ہے سرمایہ داروں کی لٹیروں کی صدا
یہ صدا ان کی ہے جن کی نفع خوری کا جنون
چوستا ہے سینۂ مزدور سے دن رات خون
یہ صدا ان کی ہے جو برطانیہ کے ہیں غلام
یہ صدا ان کی ہے جو سنگھانیہ کے ہیں غلام
یہ صدا ان کی ہے ٹاٹا نے اُبھارا ہے جنھیں
یہ صدا ان کی ہے برلا نے سنوارا ہے جنھیں
دشمنی نے کر دیا ہے تم کو کتنا بے خبر
کس کا نغمہ گا رہے ہو کانگریس کے ساز پر
لال جھنڈا پھینک دو ، ہٹلر پکارا تھا یہی
لال جھنڈا پھینک دو،ٹوجو کا نعرہ تھا یہی
لال جھنڈا پھینک دو، تھا یہ مسولینی کا حکم
کیا انھیں کے راستوں پر چل رہے ہو آج تم
اے کہ تم کرنے اٹھے ہو آج ہم سے دو تی
لال جھنڈا کس کا جھنڈا ہے یہ سوچا بھی کبھی

یہ وہ جھنڈا ہے لرز جاتے ہیں جن سے تاجدار
یہ وہ جھنڈا ہے اُٹھے ہیں لے کے جس کو کامگار
یہ وہ جھنڈا ہے کیا ہے جس نے ہم کو سرخرو
اس میں ہے پاپا میاں کے گرم سینے کا لہو
اس کی لہروں میں ہے ماروتی کی انگڑائی کا رنگ
اس کی رنگت میں گھلی ہے باگھ مارے کی اُمنگ
اس کی سرخی میں ہے مزدوروں کسانوں کا لہو
اس میں ہے کیور کے کڑیل جوانوں کا لہو
تم نے کا ہے کو سنی ہوگی کبھی یہ داستاں
نام ماروتی تھا کس کو کون تھے پاپا میاں
باگھ مارے کو مگر پہچانتے ہوگے ضرور
اپنے ہی مارے ہوئے کو جانتے ہوگے ضرور
کانگرس ہی کی وزارت جب یہاں تھی حکمراں
سینۂ مزدور پر برسیں دنادن گولیاں
قوم کی پہلی حکومت اور یہ ظلم و جفا
اپنا ساتھی باگھ مارے جان سے مارا گیا
کس قدر افسوس ہے اے بھولے بھالے دوستو
تم ہمیں سے کہہ رہے ہو لال جھنڈا پھینک دو
یہ وہ جھنڈا ہے جو جانوں سے بھی پیارا ہے ہمیں
اس نے ہر پستی سے دلدل سے اُبھارا ہے ہمیں
اس نے گُر تنظیم و قوت کا سکھایا ہے ہمیں

ایکتا کا راستہ اس نے دکھایا ہے ہمیں
اس کے دامن میں جگہ پاتا نہیں فتنہ فساد
آج بھی سب کو سکھاتا ہے یہ جھنڈا اتحاد
ملک میں پھیلا رہے ہیں آج کل جو انتشار
کر رہا ہے کون ان بھٹکے ہوؤں کو ہوشیار
جب وطن میں ہر طرف تھا دور دورہ یاس کا
کس نے در جیلوں کے کھٹکائے کہ لیڈر ہوں رہا
جھوٹ کا جب حکمرانوں نے بچھا رکھا تھا دام
لگ رہا تھا کانگرس پر فاشیت کا اتہام
ملک بھر سے کون اٹھا کانگرس کے نام پر
بن کے بجلی کون ٹوٹا سامراجی دام پر
جب دبا رکھا تھا ظالم نفع خوروں نے اناج
بک رہی تھی راستوں میں ماؤں اور بہنوں کی لاج
کون اٹھا بنگال کو اس دم بچانے کے لئے
بھوک کے ظالم شکنجے سے چھڑانے کے لئے
آ گیا تھا سر پہ جب جاپان دندناتا ہوا
کون اٹھا تھا حفاظت کی قسم کھاتا ہوا
لڑ رہا تھا کون اس دن ملک و ملت کے لئے
کس نے جدوجہد کی قومی حکومت کے لئے
مشکلوں میں کام جو آتا ہے وہ ہمدم ہے یہ
جو ہمارے سر پہ لہراتا ہے وہ پرچم ہے یہ

یوں تو جھنڈے اور بھی ہیں ملک میں چھوٹے بڑے
کون لڑتا ہے مگر محنت کشوں کے واسطے
تم الکشن کے لئے ہم پر ہوئے ہو مہرباں
یہ الکشن ختم ہو پھر تم کہاں اور ہم کہاں
کون پھر سرمایہ داروں سے بچائے گا ہمیں
کون بونس کون مہنگائی دلائے گا ہمیں
کوئی قوت ہم سے یہ جھنڈا چھڑا سکتی نہیں
کوئی بجلی اس پھریرے کو جلا سکتی نہیں
یہ وہ جھنڈا ہے جو امریکہ میں لہراتا ہے آج
یہ وہ جھنڈا ہے جو لندن میں بھی بل کھاتا ہے آج
یہ وہ جھنڈا ہے جو ہے پیرس کے دل پر حکمراں
لے رہا ہے سینۂ برلن پہ بھی انگڑائیاں
یہ وہ جھنڈا ہے جو کل یورپ پہ ہے چھایا ہوا
چین کے رنگیں افق پر بھی ہے لہرایا ہوا
یہ وہ ہے اپنا غریبوں نے بنایا ہے جسے
یہ وہ ہے جاوانے کاندھے پر اٹھایا ہے جسے
لے کے یہ جھنڈا یونہی آگے بڑھے جائیں گے ہم
چڑھ کے پھانسی پر بھی اس جھنڈے کو لہرائیں گے ہم
نصب کر دیں گے اسے اک روز ہر دیوار میں
کارخانوں میں ملوں میں، کھیت میں بازار میں

☆

سپردگی

اے کہ تم دردِ غلامی کی دوا بھول گئے
کھا کے دلّی کی ہوا عہد وفا بھول گئے
دوست سے روٹھ کے غیروں کی جفا بھول گئے
باہمی جنگ میں دشمن کا گلا بھول گئے
اتنا ٹکرائے ہو آپس میں کہ خود کانپتے ہو
یونین جیک کے سائے میں کھڑے ہانپتے ہو

یاد تو ہوگا تمہیں بھی وہ غلامانہ چلن
گھر کے جھگڑوں میں رہا کرتے تھے تم دونوں مگن
آ گیا بیچ لڑائی میں جو لندن سے مشن
شملہ رو ہو کے جھکا دی گئی آخر گردن
درِ ویول [1] پہ ہرجی اور قمی ایک ہوئے
"اس کے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے"

وہی فوجیں، وہی سنگینیں وہی شمشیریں
وہی فرمان، وہی جور، وہی تعزیریں
وہی جلّاد، وہی دار، وہی زنجیریں

(۱) وائسرائے لارڈ ویول

تم نے آزادی کی دیکھی ہیں کدھر تصویریں
زخم سینے کا کسی میں نہ چھپاؤ ہم سے
رہبرو آج نگاہیں تو ملاؤ ہم سے

مادرِ ہند کے ہونٹوں پہ فغاں ہے کہ نہیں
روئے ملت پہ غلامی کا دھواں ہے کہ نہیں
روح کو آج بھی احساسِ زیاں ہے کہ نہیں
پاؤں میں آج بھی زنجیر گراں ہے کہ نہیں
جہد و قربانی و ایثار کا حاصل ہے یہی
کیا جہاں دوز کے تم بیٹھے ہو منزل ہے یہی

تم نے سر سامنے دشمن کے جھکایا کیسے؟
اپنے بے کاروں کو نعروں کو بھلایا کیسے؟
فتح کا تاج لٹیروں کو پہنایا کیسے؟
بڑھ کے جلاد کو سینے سے لگایا کیسے؟
جبریہ صلح پہ کہنا تھا بہر طور نہیں
تم نمائندے ہمارے ہو کوئی اور نہیں

جنبشِ لب در دشمن پہ، صدا کی توہین
غیر سے دوست کی فریاد، وفا کی توہین
تکیہ ابلیس پہ، عرفانِ خدا کی توہین
صلحِ جلاد، سے خونِ شہدا کی توہین
منجمد خون میں شعلے سے تپاں ہیں دیکھو
افقِ دار سے لاشیں نگراں ہیں دیکھو

جاؤ چپ گاؤں کے جاں باز گنہ گار سہی
ویر پنجاب کے بنگال کے بدکار سہی
تھا بھگت سنگھ خطاوار خطا وار سہی
لال کیور کے غدار تھے غدار سہی
موپلا سے تو کبھی شکوۂ بیداد سنو
سن بیالیس کے کشتوں کی تو فریاد سنو

اشک لو دینے لگے رقصِ شرر سے پہلے
آگ دوڑی رگِ احساس پہ گھر سے پہلے
تھی ہمیں فکرِ رفو زخمِ جگر سے پہلے
چونک اٹھے ہیں ہم صبحِ غدر(۱) سے پہلے
خواب پہ بھی اثرِ سلسلۂ خواب نہیں
اپنی تاریخ میں غفلت کا کوئی باب نہیں

(۱) میں نے دانستہ طور پر "غدر" کو "شرر" کے وزن پر استعمال کیا ہے

ذکرِ ماضی نہ سنو حال کے تیور دیکھو
کوندتے ہیں خس و خاشاک میں خنجر دیکھو
ہاں نہتوں سے کبھی آنکھ ملا کر دیکھو
ایک اک شیر ہے بپھرا ہوا، لشکر دیکھو
تم رہے جاتے ہو پیچھے وہ بڑھے جاتے ہیں
نوجواں موت کے سینے پہ چڑھے جاتے ہیں

آگ کشمیر کے سینے میں بھڑکتی ہے اٹھو
ساحلِ ہند پہ برق اب بھی کڑکتی ہے اٹھو
روحِ زندانِ غلامی میں پھڑکتی ہے اٹھو
چھاتی ہر فیکٹری کی آج دھڑکتی ہے اٹھو
ذرّے ذرّے میں ہیں بے تاب شرارے لاکھوں
صفِ دشمن میں بھی ہیں دوست تمھارے لاکھوں

آج اس بارِ غلامی سے بہت چور ہیں سب
بھوک سے پیاس سے آزار سے رنجور ہیں سب
جان دے دینے پہ لڑ جانے پہ مجبور ہیں سب
پھونک وہ صور کہ اب منتظرِ صور ہیں سب
ایک جھٹکے میں فقط طوق اتر جائے گا
ورنہ ٹھکرا کے تمھیں وقت گذر جائے گا

جون ۴۶ء

قومی حکمراں

یہ جانتا ہوں کہ حکمرانی کی ساری رسمیں ادا کرو گے
ستم کو انصاف، ظلم کو مصلحت کا تمغہ عطا کرو گے

سیا بڑی شان سے حکومت کا دامن تار تار تم نے
اٹھا لیا اپنے سر پہ برطانیہ کے کاندھے کا بار تم نے
بڑھا دیا آنکھ بند کر کے پولیس کا اقتدار تم نے
بٹھا دیا نفع خوروں، چوروں کو دیش بھگتی کا بار تم نے
مگر غریبوں سے جو کیے ہیں وہ وعدے کب تک وفا کرو گے

خود اپنے ہاتھوں سے بڑھنے والوں کو طوق بیڑی پنھا رہے ہو
جو جیل خانے اجڑ چلے تھے تم اُن کی رونق بڑھا رہے ہو
غریب محنت کشوں کے ہر مورچے کو ہنس ہنس کے ڈھا رہے ہو
لہو کسانوں کا چپہ چپہ زمیں کی خاطر بہا رہے ہو
معاوضہ اور کیا زمینوں کے غاصبوں کو ادا کرو گے

سہے گا بھارت ستم کہاں تک، عوام اٹھائیں گے ناز کب تک
گلا دبائے گا حریت کا تمھارا دستِ دراز کب تک
سبھاؤں کو توڑنے، کچلنے کی ہوگی یہ ساز باز کب تک
اڑیں گے بپھری فضا میں لے کر تمھیں ہوائی جہاز کب تک
کبھی تو آخر زمین کے ساکنوں کا بھی سامنا کرو گے

یہ کیسے جلسے ہیں جن میں ویول کی جعلسازی جھلک رہی ہے
یہ کیسا لہجہ ہے جس میں سنگھانیا کی چاندی کھنک رہی ہے
اٹھی ہے کھیتوں سے سرخ آندھی ملوں میں بجلی چمک رہی ہے
تمھارا منہ مادرِ وطن آج کتنی حسرت سے تک رہی ہے
جو کہہ چکے ہو وہ کر دکھاؤ سہارے کب تک دیا کرو گے

غضب کا بھونچال ہے پرانے محل سے باہر نکل بھی آؤ
یہ میہماں راہزن سے بدتر تھے ان پہ اتنا ترس نہ کھاؤ
اکھڑ چکے پاؤں جس کے اس فوج کی نہ ٹوٹی صفیں جماؤ
بھڑک چکی آتشِ بغاوت اسے نہ گھبرا کے اب بجھاؤ
کہیں لپک کر تمھارا دامن پکڑ لیں شعلے تو کیا کرو گے

سروجنی نائیڈو

عزیز ماں، مری جنسِ ملک، مری بہادر ماں
تمام جوہرِ فطرت جگا دیے تو نے
محبت اپنے چمن سے، گلوں سے، خاروں سے
محبتوں کے خزانے لٹا دیے تو نے

بنا بنا کے مٹائے گئے نقوشِ عمل
ترے بغیر مکمل نہ ہو سکی تصویر
وہ خواب جھانسی کی رانی کو جس نے چونکایا
ترا جہادِ مسلسل اسی کی ہے تعبیر

اسے حیات کا سولہ سنگار کہتے ہیں
تری جبیں پہ ہیں کچھ سلوٹیں بھی ٹیکا بھی
نظر میں جذبِ یقیں، دل میں سوزِ آزادی
دہکتا پھول بھی ہے تو مہکتا شعلہ بھی

ذرا زمیں کو محور پہ گھوم لینے دے
یہ دنیا تجھ سے ترا سوز و ساز مانگے گی
جمال سیکھے گا خود اعتمادیاں تجھ سے
حیات تو ترے دل کا گداز مانگے گی

☆

حملہ

(ریاست ٹراونکور کے مجاہدوں کا ترانہ)

بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو
نظامِ غلامی مٹاتے چلو

وہ دیکھو محل ہے وہ ایوان ہے
وہ مغرور راجہ وہ دیوان ہے
اب انسان کی زد پہ شیطان ہے
قدم اور اپنے بڑھاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

ہمارے ارادوں پہ پابندیاں
قوانین میں اتنا کس بل کہاں
ہمارے رفیقوں پہ یہ سختیاں
چلو جیل خانوں کو ڈھاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

یہ دیوان کا مجرمانہ عتاب
ہے بجھتی ہوئی آگ کا التہاب

یہی مارشل لاکا ہے اک جواب
کہ ہر چھاونی کو مٹاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

لہو پی کے بڑھتا ہے شاہی جنوں
اہنسا سے ہوتی ہے وحشت فزوں

یہ راہوں میں بہتا ہے جو گرم خوں
اسی خوں سے طوفاں اٹھاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

یہ راجہ یہ انگریز کے میزباں
ہیں بھارت میں انگلینڈ کے پاسباں

جہاں پائی ہے رہزنوں نے اماں
وہ دیوار وہ در گراتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

سنو نعرۂ جنگ کشمیر کا
سنو حیدرآباد کا ہم ہمہ

لگاؤ ہر اک موڑ پہ مورچہ
ہر اک رخ سے بجلی گراتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

ہوا قلب بھوپال شعلہ فگن
بھرت پور میں پڑنے والا ہے رن

جو بیدار ہیں اُن سے کہدو بڑھن
جو غافل ہیں ان کو جگاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

جدھر بڑھ رہا ہے ہمارا نشاں
اسی سمت ہے آج دنیا رواں

ابھی آئیں گے سیکڑوں کارواں
چراغ آندھیوں میں جلاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

حکومت کا ہم لوٹ لیں گے سہاگ
نظامِ کہن کا لگا دیں گے آگ
یہی ایک دھن ایک لے ایک راگ
یہی جاں فزا گیت گاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

سکھو، ہندو، پارسی بھائیو
ہریجن، مسلمانو، عیسائیو
وطن، قوم، ملت کے شیدائیو
قدم کو قدم سے ملاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

چلو وادیو، ساحلو، ولولو
چلو معدنو، کھیتو، جنگلو
چلو بجلیو، آندھیو، زلزلو
پہاڑوں کا سینہ ہلاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

گھٹے ہیں ہم ہند کے سورما
کہیں دب نہ جائے ہماری صدا
لرز جائیں دلی کے ارض و سما
کچھ اس طرح نعرے لگاتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو

☆

قومی اخبار

آج پھر قائد و ویول کی ملاقات ہوئی
جنگلی استھان میں پھر کوئی نئی بات ہوئی
سانحۂ قتل کے دوچار ہوئے شہر میں آج
آنے ہی والا ہے کچھ روز میں باہر سے اناج
چاٹے پی نہرو نے کل والیِ بھوپال کے ساتھ
لیگ آسام طلب کرتی ہے بنگال کے ساتھ
راست اقدام کی ہم ٹھان چکے ہیں دل سے
"ویٹو پاور" نہیں لے سکتا کوئی ویول سے
صحت آزاد کی پھر گر گئی زندہ ہیں سبھاش
نظر آتی ہے تو کھائی میں اب لاش ہی لاش
"پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں میرا"
پورے چھے صوبوں کو لے لیتا ہے ایماں میرا
شام کو باپو سے ملنے گئے سردار پٹیل
روس پی جانے پہ آمادہ ہے ایران کا تیل

ختم کچھ روز میں اب چین کا جھگڑا ہوگا
آج سے رانچی میں وامق و عذرا ہوگا
نہرو بچوں پہ بھی تلوار چلا دیتا ہے
عکس چہرے کا ہر اک داغ مٹا دیتا ہے
روس و امریکہ نئی جنگ پہ تیار ہوئے
کھڑکی آج ذرا دیر میں بیدار ہوئے
کہہ دے گاندھی کو فنا اردو زباں ہو جائے
یہ دوا کھالے جو بوڑھا تو جواں ہو جائے
لیگ ویول کے اشارے پہ اٹھاتی ہے قدم
کانگرس دشمنِ اسلام ہے آصف کی قسم
غنڈے کمیونسٹ ہی مزدوروں کو بھڑکاتے ہیں
پنت رو دیتے ہیں جب گولیاں چلواتے ہیں
یہ حقیقت ہے ذرا جھوٹ نہیں وہم نہیں
ہم طرفدار میں غالبؔ کے سخن فہم نہیں

☆

تاریکی میں

(الیکشن کے دنوں میں مولانا آزاد اور خضر حیات کی ایک ملاقات)

سناؤں تمھیں بات اک رات کی
ہے وہ رات خفیہ ملاقات کی

تھا اجڑا ہوا سا فضاؤں کا باغ
ستاروں نے گل کر دیے تھے چراغ

وہ آرام وہ خواب وہ سرخوشی
کہ بوجھل تھی ہر سانس لاہور کی

نہ کھلتی تھیں کلیاں نہ اٹھتے تھے سر
تھے عاشق بھی معشوق سے بے خبر

کسی کو کسی کا نہ تھا انتظار
بس اس وقت دو شخص تھے بے قرار

تھے ہوٹل میں بے چین آزاد اُدھر
اِدھر خضر تکیے پہ دھنتے تھے سر

دبائے نہ جب دب سکی بے کلی
اسی وقت ٹھہری ملاقات کی

مکمل ہر اک آرزو ہوگئی
نگاہیں ملیں گفتگو ہوگئی

ملاقات تھی وہ کہ تھی ساز باز
بتاؤں کسی کام کا ہے کو راز

کٹی رات حرف و حکایات میں
سحر ہو گئی بات کی بات میں

پڑی تھی جو خود کو چھپانے کی فکر
نکل آئے ہوٹل سے گھبرا کے خضر

بٹھا کر انھیں کار چلتی ہوئی
سحر رہ گئی بات ملتی ہوئی

☆

دسمبر ۴۵ء

مثنوی

ناقص بھرتی

ہوا جب الکشن کا سورج طلوع
ہوئی لیگ میں عام بھرتی شروع
نکالے ہوئے پھر بلائے گئے
دغا باز سر پر بٹھائے گئے
بہت دن سے تھا دل میں یہ پیچ و تاب
ملے خضر کا کوئی بڑھیا جواب
جو اتنا ہی بھاری زمیندار ہو
جو ایسا ہی محبوب سرکار ہو
پڑی ٹون پر لیگ کی جب نظر
گلے سے لگا ہی لیا دوڑ کر

"چمکدار کپڑا جو بھایا اسے
تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اسے"

☆

دسمبر ۴۵ء

خانہ جنگی

"کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی"

جب سے آکر گئے ہیں اہلِ مشن
زندگی کا بگڑ گیا ہے چلن

بھائی بھائی کا خوں بہاتا ہے
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

آنکھ پڑتی ہے جس کے ماتھے پر
تیوریوں میں چمکتے ہیں خنجر

ہر طرف شور ہے دوہائی ہے
گھر کی تقسیم پر لڑائی ہے

سوکھتی ہے پڑوسیوں سے جان
دوستوں پر ہے قاتلوں کا گمان

لوگ گھر سے نکلتے ڈرتے ہیں
راستے سائیں سائیں کرتے ہیں

شہر ویراں ہیں بند ہیں بازار
اینڈتا ہے فضا میں گرم غبار

ناکے ناکے پہ ہے پولیس کا راج
ہوچکی ہے گلی گلی تاراج

جیپ ہر موڑ سے گذرتی ہے
ہر طرف فوج گشت کرتی ہے

بول اے سرزمینِ کلکتہ
کون شعلوں کو دے رہا ہے ہوا

لگ گئی کتنے آنچلوں میں آگ
لٹ گیا کتنی دیویوں کا سہاگ

ظلم اپنوں نے کتنے ڈھائے ہیں
کتنے گھر فوج نے جلائے ہیں

ہوگئے بند کتنے کاروبار
کتنے مزدور بیٹھے ہیں بے کار

مٹ گئی آس بدنصیبوں کی
روٹیاں چھن گئیں غریبوں کی

خون رہ خون اے نواکھالی
ہوگئے دیکھ گھر کے گھر خالی

فطرتِ شرع میں فساد نہیں
رہزنی داخلِ جہاد نہیں

کہہ کے تکبیر باندھ کر نیت
ماؤں بہنوں کی لوٹ لی عزت

راست اقدام خوں میں ڈوب گیا
آج اسلام خوں میں ڈوب گیا

اے بہار ان کو کچھ تسلی دے
بہنیں روتی ہیں بھائیوں کے لئے

غم میں بچوں کے جاں گنواتی ہیں
مائیں سو سو پچھاڑیں کھاتی ہیں

تیری روحانیت کا کیا کہنا
تو نے بچوں کا خون چوس لیا

گیت گاکر مہاتما جی کے
پیٹ ماؤں کے چاک کر ڈالے

دل میں بہنوں کے گاڑ کر بھالا
منہ کیا ملک و قوم کا کالا

خوب اپنوں سے انتقام لیا
جاتے دشمن کا پاؤں تھام لیا

دیکھ اے بمبئی، بتا دلی
بہتی ہے کس کے خون کی ندی

خون بوڑھوں کا، نوجوانوں کا
خون بچوں کا، بے زبانوں کا

خون بہنوں کا، خون ماؤں کا
خون دکھیوں کا بے نواؤں کا

خون دامن پہ آستینوں پر
خون گردن پہ خوں جبینوں پر

خوں اچھائی پہ جلالی پہ　　خوں ترنگے پہ خوں ہلالی پہ
خون مذہب پہ خون ایماں پہ　　خون ویدوں پہ خون قرآں پہ

چارسو خون چارسو لاشیں
لو یہ کو خون رو برو لاشیں

ہو کہاں فتنہ دوست راہبرو　　آؤ لاشیں ذرا شمار کرو
لو یہ انعام رہنمائی کا　　لو یہ لاشوں کا خون کا تحفہ
لو یہ ہے شیخ و برہمن کی لاش　　نسل کی، قوم کی، وطن کی لاش
لاش علم و ادب کی حکمت کی　　لاش کلچر کی آدمیت کی
لاش ٹیپو سے سورما کی لاش　　لاش نانک کی، پیشوا کی لاش
لاش سوراج کی خلافت کی　　لاش ہر جہد ہر بغاوت کی

ہو کہاں فتنہ دوست راہبرو
آؤ لاشیں ذرا شمار کرو
لو یہ انعام رہنمائی کا
لو یہ لاشوں کا خون کا تحفہ

لو محمد علی کی لاش ہے یہ　　لو تلک سے ولی کی لاش ہے یہ
لو بھگت سنگھ سے جوان کی لاش　　لو یہ ہے سوبیا کی لاش
لاش ہے یہ علامہ ذات کی　　لاش ہے یہ اکھنڈ بھارت کی

ہو کہاں فتنہ دوست راہبرو
آؤ لاشیں ذرا شمار کرو
لو یہ انعام رہنمائی کا
لو یہ لاشوں کا خون کا تحفہ
بیٹھ جاؤ سرہانے لاشوں کے
تم تو ہیرو ہو ان تماشوں کے

آفریں ہندو مسلمانو　　لیگ کے کانگریس کے پروانو
خون کے ایک ایک قطرے کا　　تم نے اپنوں سے لے لیا بدلہ

لیکن اس سے ملا سکے نہ نگاہ
کر دیا جس نے زندگی کو تباہ

مندروں کی زمینیں دہلا دیں　　قصر کے ساتھ مسجدیں ڈھا دیں
مورتوں کے گلوں سے ہار لیے　　مقبروں کے کلس اتار لیے
چھان ڈالے تمام خشک و تر　　بھر لیے دامنوں میں لعل و گہر
روئے کشمیر سے اڑا لی آب　　لوٹ لی شان و شوکت پنجاب
ہوگئی مالوے کی نیند حرام　　رات دے کے اودھ سے لے لی شام
زلف بنگال برہنہ کے بکھرا دی　　صبح کاشی پہ دھوپ دوڑا دی
انکھڑیوں کا سرور چھین لیا　　عصمتوں کا غرور چھین لیا
عارضوں کے گلاب توڑ لیے　　ماہتاب، آفتاب توڑ لیے
ڈال دیں گتھیاں ترنم میں　　کرب حل کر دیا تبسم میں

علم و فن کا جلا دیا دامن
صنعتوں کی مروڑ دی گردن
بزدلی، بے حیائی، جہل، فرار
زندگی کو لگا دیے آزار
قید کی ہر خوشی دفینے میں
بھوک بودی زمیں کے سینے میں
راجہ، نواب، سر، منافع خور
لا کے گھر میں بسا دیے سو چور
زیست کا بند بند کھول دیا
پھوٹ کا زہر خوں میں گھول دیا

وہ مگر حکمراں ہے کیا کہیے
اس کا سکہ رواں ہے کیا کہیے

وقت بدلا، بدل گئی دنیا
تپ کے سانچے میں ڈھل گئی دنیا
ملک کے ملک ہو گئے آزاد
ہو رہا ہے نیا جہاں آباد
زہر اترا ہے تلخ کامی کا
مٹ رہا ہے نشاں غلامی کا
کوششوں نے بدل دیں تقدیریں
توڑ دیں کروڑوں نے زنجیریں

تشنہ کاموں کے پاس جام آیا
دورِ آزادیٔ عوام آیا

اور یہاں ہے ابھی وہی رفتار
باہمی جنگ باہمی پیکار
منزلِ فتح کے قریب آ کر
اپنے وقتے پہ پھٹ پڑا لشکر
جوڑ کر تیر ہاتھ موڑ دیا
لا کے دشمن کو زد پہ چھوڑ دیا
حال و ماضی کی التجا نہ سنی
اپنی تاریخ کی صدا نہ سنی
ہو گئی محو داستانِ جہاد
مٹ گئی اپنے ہمدموں کی یاد
شورِ آتش زنی کہاں نہ اٹھا
یونین جیک سے دھواں نہ اٹھا

ہندو مسلم وطن کو بھول گئے
سر تو کاٹے رن کو بھول گئے

یاد ہوگا کہ وہ یوم رشید
وہ دلیروں، بہادروں کی عید
وہ سماں سازِ جنگ بجنے کا
وقت وہ گونجنے گرجنے کا
خوں شدہ انگلیوں میں لرزاں آگ
تشنہ ہونٹوں پہ انقلاب کا راگ
حال و ماضی کا زخم سینوں پر
سرخیٔ عہد تو جبینوں پہ
پنجۂ جبر موڑنے کا عہد
طوق و زنجیر توڑنے کا عہد

کہنہ ایوان ڈھانے کی تدبیر
نئی دنیا بسانے کی تدبیر

قابلِ دید تھا جہاد کا جوش
ہندو مسلم رواں تھے دوش بدوش
ایک ساتھ اٹھ رہے تھے سب کے قدم
ایک ساتھ اڑ رہے تھے سب پرچم
وہ ترنگے کا کھل کے لہرانا
وہ ہلالی علم کا بل کھانا
لال جھنڈا وہ دل بڑھائے ہوئے
وہ جواں تیوریاں چڑھائے ہوئے
ایک ہی جست ایک ہی رفتار
ایک ہی نعرہ ایک ہی للکار
ایک ہی سعی ایک ہی حاصل
ایک ہی مقصد ایک ہی منزل
گولیاں خوں میں بھر رہی تھیں زقند
گیس نظروں پہ ڈالتی تھی کمند
برچھیاں دل میں توڑتی تھیں خار
فوج چنتی تھی راہ میں دیوار

پھر بھی بڑھتا ہی جا رہا تھا جلوس
ساری دیواریں ڈھا رہا تھا جلوس

شاد طبع ملول ہو نہ سکی
وہ دعا بھی قبول ہو نہ سکی

یاد آتا ہے آج رو رو کر   ساحل بمبئی ترا منظر
وہ جیالے وہ دل جلے ملاح   وہ بہادر وہ من چلے ملاح
جن کو تڑپا رہی تھی محکومی   خون کھولا رہی تھی محکومی
ظلم انسان کس قدر سہتے   کب تک آخر غریب چپ رہتے
زندگی کو جلال آ ہی گیا
سرد خوں میں اُبال آ ہی گیا

برق چمکی بسمت گئے بادل   چھڑ گئی جنگ پڑ گئی ہلچل
آ گئی جان ناتوانوں میں   اسلحے بٹ گئے جوانوں میں
سوز غیرت کی آزمائش تھی   ملک و ملت کی آزمائش تھی
امتحاں شیخ و برہمن کا تھا   امتحاں قوم کا وطن کا تھا
فتح کی آرزو میں بڑھ بڑھ کر   گولیاں روکتے تھے سینوں پہ
توپ کے منہ پہ چڑھ کر لڑتے تھے   موت پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے
ہوش پڑاں تھے حکمرانوں کے   پرزے اڑتے تھے بادبانوں کے
جھومتے تھے مچلتے تھے طوفاں   کشتیوں سے اُلجھتے تھے طوفاں
موج دھارے کو موڑ دیتی تھی   لہر ساحل کو توڑ دیتی تھی
تھے سمندر پہ سکہ زن جاں باز
لے کے طوفان میں کھڑے تھے جہاز

روح ٹیگور کی تھی زمزمہ خواں   چشم سی۔آر۔داس تھی نگراں
جیل خانوں سے آتی تھی آواز   ہاں یہی حوصلے یہی انداز
تھی شہیدوں کی یاد گرم عمل   خوں کی بوندوں میں کھل رہے تھے کنول
طوق گلے کے پگھلنے والا تھا
ملک کروٹ بدلنے والا تھا

اب مگر کچھ بجز انفعال کہاں   ”وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں“
ہاتھ تھرائے تیغ چھوٹ گئی   تیر بہکے کمان ٹوٹ گئی
دے کے دشمن کو فتح کا پیغام
منتشر ہو گیا جلوس تمام

ارض بنگال یاد تو ہوگا   تجھ کو منظر وہ ایک مرقد کا
جمع ہندو بھی تھے مسلماں بھی   دھرم بھی سرنگوں تھا قرآں کا
مرنے والے کا تھا دلوں پہ راج   خون اشکوں سے لے رہا تھا خراج
لے کے مٹھی میں قبر کی مٹی   اک مسلمان نے دعا کی تھی
اے شہید اے دلیر اے سردار   اے سراپا مرقع ایثار
اُولوالعزم، اے بلند اقبال   دولت قوم نازش بنگال
کاش یہ تیری قبر کی مٹی   ہو بنا صلح ملک و ملت کی
کاش یہ تیرا گرم گرم لہو   بخش دے کشت ووٹ کو نمو
نقش رنگ جہاد میں بھر دے   ہندو مسلم کو متحد کر دے
عارضی صلح حرز جاں ہو جائے   کاش یہ لمحہ جاوداں ہو جائے

بحر و بر کی لچک رہی تھی کمر
امڈا آتا تھا شہر ساحل پہ
تھی زمیں برہم آسماں برہم
طفل برہم تھے نوجواں برہم
تھیں ضعیفوں کی انکھڑیاں گلنار
چتونوں میں مچل رہے تھے شرار
شور تھا ڈھا دو حاکموں کا غرور
توڑ دو ظلم و جبر کا دستور
ختم کر دو بہیمیت کا راج
فرقِ جلاد سے گرا دو تاج

جس قدر کر رہی تھی فوج ستم
جم رہے تھے مجاہدوں کے قدم
سختیاں حوصلہ بڑھاتی تھیں
تیوریاں اور چڑھتی جاتی تھیں
ان کو آساں نہ تھا دبا دینا
کھیل جن کا تھا جاں گنوا دینا
کامگاروں کا دیدنی تھا جلال
غیظ میں ہو گئے تھے چہرے لال
رک گئی تھی گرج مشینوں کی
کارخانوں میں دھول اڑتی تھی
اونگھتے تھے ملوں کے رکھوالے
پھاٹکوں میں لٹکتے تھے تالے

ایک دن تھی یہ دار و گیرِ جہاں
راج ہے اب موالیوں کا وہاں
گر پڑی دستِ قوم سے شمشیر
بنتے بنتے بگڑ گئی تقدیر
رہنماؤں نے ساتھ چھوڑ دیا
آسرا قافلے کا توڑ دیا
کر دیے دوڑ دوڑ کر سر خم
اپنے ہاتھوں جھکا دیے پرچم
قاتلوں کے گلوں میں ڈالے ہار
چوم لی بڑھ کے خوں بھری تلوار

مائلِ لطف تھے جو اہلِ مشن
عاجزانہ بڑھا دیے دامن
ہو کے مسرور دے کے دل سے دعا
خانہ جنگی کا لے لیا تحفہ

☆

عوام

اے وطن اس قدر اداس نہ ہو — اس قدر غرقِ رنج و یاس نہ ہو
خانہ جنگی ہے آخری حربہ — مذہب پرستوں کا حکمرانوں کا
سانپ جس وقت چوٹ کھاتا ہے — زیرِ پھنکار سے اڑاتا ہے
جب سور زخم کھا کے مرتے ہیں — پھاڑ کھانے کو جست کرتے ہیں
یونہی آتا ہے انقلاب جہاں — اور بدلتا ہے زیست کا عنواں
حکمراں، حکمراں کے رکھوالے — یہ ملوں والے، یہ زمیں والے
صاحبِ جاہ، تفرقہ پرداز — انتشار آفریں نفاق نواز
گمرہی، جہل، وہم کے رہبر — دورِ محکومیت کے نورِ نظر
اپنی آئی کو ٹالنے کے لئے — گرتی پگڑی سنبھالنے کے لئے

آڑ ظلم و ستم کی لیتے ہیں
بھائیوں کو لڑا بھی دیتے ہیں

لیکن اے غمزدہ غریب وطن — کہیں رکتا ہے انقلاب کا گھن
قلبِ جمہور ہو چکا بیدار — عزمِ مزدور ہو چکا بیدار
لی کسانوں نے تن کے انگڑائی — نوجوانوں نے کی صف آرائی
سن کے کشمیر کے جہاد کا شور — جاگ اٹھی جرأت تراوگور

کشتائی زمین پٹیالہ حملہ آور ہوا تلنگانہ

خانہ جنگی کے اس اندھیرے میں
جل رہی ہیں ہزار قندیلیں

رک سکے گا نہ زندگی کا وار — مڑ سکے گی نہ تیغِ وقت کی دھار
جھک سکے گا نہ انقلاب کا سر — بجھ سکیں گے نہ حریت کے شرر
ہو سکے گا نہ ارتقا گھائل — مر سکے گی نہ روحِ مستقبل
سوئے بنگال دیکھ بارِ دگر — نوجواں اٹھ پڑے ہیں بل کھا کر
تیری بگڑی بنانے اٹھے ہیں — آگ گھر کی بجھانے اٹھے ہیں
پھر کھلا اتحاد کا پرچم — ہندو مسلم ہوئے ہیں پھر سے بہم
لہر پھر آگئی بغاوت کی — نبض چھٹی ہے پھر حکومت کی
پھر حمیت نے آگ بھڑکائی — نوجوانوں نے پھر قسم کھائی
خون سے لیں گے خون کا بدلہ — گھونٹ دیں گے بہیمیت کا گلا
ہم کو کب تک لڑائیں گے انگریز — جال کب تک بچھائیں گے انگریز
یادِ یومِ رشید کی سوگند — ہر جری ہر شہید کی سوگند
بمبئی کے جہازیوں کی قسم — سورماؤں کی غازیوں کی قسم

پھوٹ کی آگ ہم بجھا دیں گے
قتل و غارت گری مٹا دیں گے
ہیر تھا چند بھائی بھائی کا
رخ بدل دیں گے اس لڑائی کا

رکھ کے ایوانِ صلح کی بنیاد   مسکراتی ہے ارضِ حُسن آباد
پڑ نہیں سکتی اس پہ پھوٹ کی چھاؤں   لال جھنڈے کا قلعہ ہے یہ گاؤں
ہے یہ جنگ اور جہاد کی بستی   باہمی اتحاد کی بستی
ہے یہ عزت کی آن کی دنیا   جاگے چونکے کسان کی دنیا
کچھ یہاں بھی ہیں صاحبِ ایماں   جو بچاتے ہیں بے کسوں کی جاں

کام جو بھائیوں کے آتے ہیں
زخمیوں کو گلے لگاتے ہیں

جب سلگنے لگا نواکھالی   اور آگ آس پاس پھیل گئی
سرخ پرچم لیے کسان اُٹھے   بوڑھے، نو عمر، نوجوان اٹھے
گھاٹ پر بڑھ کے کر لیا قبضہ   دائیں بائیں لگا دیا پہرہ
کھینچ دیں سرحدوں پہ دیواریں   چھین لیں مفسدوں کی تلواریں
شر پرستوں کی آس ٹوٹ گئی   لڑنے والوں کی نبض چھوٹ گئی

کچھ نہ نکلے پولیس کے ارمان
در پہ آ کر پلٹ گیا طوفان

شاطروں کی اُلٹ گئیں چالیں   جا بہ جا ہو رہی ہیں ہڑتالیں
کارخانوں سے آ رہے ہیں جلوس   منتشر صف بنا رہے ہیں جلوس
ہو رہے ہیں نئی طرح سے بہم   جن کی فطرت ہے کوشش پیہم
جن کا مذہب ہے مورچہ بندی   جن کا ایماں ہے حوصلہ مندی

جو پیمبر ہیں کامرانی کے   ہیں جو معمار زندگانی کے
زرد ہیں سُن کے تفرقہ پرواز   اتحاد اتحاد کی آواز
گیت اخوت کے گائے جاتے ہیں   خوں کے دھبّے مٹائے جاتے ہیں
بڑھتا جاتا ہے جوشِ آزادی   نعرہ زن ہے سروشِ آزادی
جھک رہی ہے بلندیوں کی جبیں   جیسے کروٹ بدل رہی ہے زمیں
شعلہ افشاں ہے صبحِ بیداری   آخری جنگ کی ہے تیاری
جنگ اُن سے جو پھوٹ ڈالتے ہیں   رات دن گندگی اچھالتے ہیں
جنگ اُن سے جو خون پیتے ہیں   لوٹ کر دوسروں کو جیتے ہیں
جنگ سکّوں کی حکمرانی سے   جنگ بڑلا سے اصفہانی سے

لوٹ سے جرم سے گناہ سے جنگ
تاج سے جنگ بادشاہ سے جنگ

لے وہ مجروح و نیم جاں بنگال   تلملا کر سنبھالتا ہے کدال
لے، وہ نکھرا ہوا لہو میں بہار   اپنے ہنسیوں کی دیکھتا ہے دھار
تھے زمیندار کس قدر مضطر   کر بجھا دیں حیات کے تیور
ڈال دیں پائے وقت میں زنجیر   رات دیکھے نہ صبح کی تنویر
ضعفِ افلاس پر رہے طاری   سر اٹھانے نہ پائے ناداری
پہلوِ حکام کے بھی گرمائے   لیڈروں سے بھی ناز اٹھوائے

کھل گئی افتراق کی تبلیغ
دشمنی کی نفاق کی تبلیغ

متحد ہوگئے کسان مگر　　آنکھ جھپکی بدل گیا منظر
گونجتے ہیں ہرے بھرے میدان　　دھان کتنا ہے گا رہے ہیں کسان
بھیڑ سی لگ گئی ہے کھیتوں پہ　　لاٹھیاں جمع ہیں منڈیروں پہ
نوجواں پینترے بدلتے ہیں　　اس طرف اس طرف اچھلتے ہیں
ہیں زمیندار دم بخود سارے　　آگے بڑھتے نہیں ہیں ہرکارے

بھوک حق اپنا آج پاتی ہے
فصل کٹتی ہے لٹتی جاتی ہے

زعم جاگیردار ڈھتا ہے　　ملکیت کا حصار ڈھتا ہے
ختم ہوتا ہے دور خوں خواری　　ٹلتی ہے لعنتِ زمینداری
جو کھپائے گا کھیتیوں میں جان　　اس کے گھر پہ لگے گا اب کھلیان
بیج جو بوئے گا اگائے گا　　دھان آنگن میں وہ سکھائے گا
قحط لے گا نہ اب کسی کی جان　　اب نہ رگڑیں گے ایڑیاں انسان
اب نہ روٹی کے ایک ٹکڑے پہ　　مائیں بیچیں گی اپنے لختِ جگر
اب نہ بکھریں گے دل جوانوں کے　　اب جھکیں گے نہ سر کسانوں کے

اب یہ طوفان بڑھتا جائے گا
اب یہ سیلاب چڑھتا جائے گا

ستمبر ۱۹۴۶ء

آوارہ سجدے

۱۹۷۴ء

انتساب

شوکت کے نام

ایسا جھونکا بھی اک آیا تھا کہ دل بجھنے لگا
تو نے اُس حال میں بھی مجھ کو سنبھالے رکھا
کچھ اندھیرے جو مرے دم سے ملے تھے تجھ کو
آفریں تجھ کو، کہ نام اُن کا اُجالے رکھا
میرے یہ سجدے جو آوارہ بھی بدنام بھی ہیں
اپنی چوکھٹ پہ سجالے جو ترے کام کے ہوں

کیفی

ترتیب

☆۔ پیش لفظ — فیض احمد فیض — ۲۶۷
☆۔ دو چار باتیں — ۲۶۹
☆۔ کچھ پیش لفظ کے بارے میں — کیفی اعظمی — ۲۷۲
۱۔ دعوت — ۲۷۳
۲۔ نیا حسن — ۲۷۵
۳۔ ایک بوسہ — ۲۷۸
۴۔ تلنگانہ — ۲۷۹
۵۔ مکان — ۲۸۲
۶۔ آوارہ سجدے — ۲۸۴
۷۔ نہرو — ۲۸۶
۸۔ آخری رات — ۲۸۸
۹۔ عادت — ۲۹۰
۱۰۔ دائرہ — ۲۹۲
۱۱۔ ابنِ مریم — ۲۹۴
۱۲۔ دوپہر — ۲۹۹
۱۳۔ بہروپنی — ۳۰۰
۱۴۔ نذرانہ — ۳۰۵
۱۵۔ سنا کرو میری جاں (غزل) — ۳۰۷
۱۶۔ پتھر کے خدا (غزل) — ۳۰۸
۱۷۔ دوسرا طوفان — ۳۰۹
۱۸۔ بیوہ — ۳۱۲
۱۹۔ پیار کا جشن — ۳۱۴
۲۰۔ اجنبی — ۳۱۶
۲۱۔ تاشقند — ۳۱۸
۲۲۔ فرغانہ — ۳۲۰
۲۳۔ ماسکو — ۳۲۲
۲۴۔ گر بھوتی — ۳۲۴

۲۵۔ لینن ۳۲۶
۲۶۔ پیرِ تسمہ پا ۳۲۸
۲۷۔ خار و خس تو اٹھیں (غزل) ۳۳۰
۲۸۔ کھلونے ۳۳۱
۲۹۔ بنگلہ دیش ۳۳۳
۳۰۔ انتشار ۳۳۵
۳۱۔ لائی پھر اک لغزش (غزل) ۳۳۶
۳۲۔ دھماکہ ۳۳۷
۳۳۔ ایک لمحہ! ۳۳۹
۳۴۔ زندگی ۳۴۰
۳۵۔ ایک دعا ۳۴۲
۳۶۔ چراغاں ۳۴۷
۳۷۔ میں ڈھونڈتا ہوں (غزل) ۳۴۹
۳۸۔ نوجوان ۳۵۰
۳۹۔ نذرِ کراچی ۳۵۳
۴۰۔ کسان ۳۵۴
۴۱۔ سومناتھ ۳۵۵
۴۲۔ مقتلِ بیروت ۳۵۷
۴۳۔ کیا جانے کسی کی (غزل) ۳۵۹
۴۴۔ کہیں سے لوٹ کے (غزل) ۳۶۰
۴۵۔ ہاتھ آ کر لگا گیا کوئی (غزل) ۳۶۱
۴۶۔ میرا ماضی میرے کاندھے پر (نظم) ۳۶۲
۴۷۔ سانپ ۳۶۳
۴۸۔ جائیے ۳۶۷
۴۹۔ شانتی بن کے قریب ۳۶۹
۵۰۔ وہ بھی سراہنے لگے (غزل) ۳۷۱
۵۱۔ شور یوں ہی نہ (غزل) ۳۷۲
۵۲۔ کی ہے کوئی حسین (غزل) ۳۷۳

☆

پیش لفظ

اس مختصر مجموعے میں کیفی اعظمی نے گزشتہ پچیس برس کا منتخب کلام شامل کیا ہے یعنی ایک طرح سے یہ ان کا سلور جوبلی ایڈیشن ہے۔ پڑھنے والوں کو شاید سب سے بڑی تو اس مجموعے کے اختصار سے شکایت ہوگی اور یہ تجسس بھی کہ کونسی چیزیں اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں اور کیوں؟۔۔۔اس کا جواب تو کیفی ہی کے پاس ہوگا لیکن اس انتخاب سے ان کے دل کا معاملہ ضرور کھل جانا چاہئے اس لیے کہ ان کے فکر و جذبہ، اور اسلوب اظہار کے سبھی پہلو اس اشاعت میں موجود ہیں۔

پچیس برس یعنی ربع صدی کا عرصہ کافی طویل عرصہ ہے جس میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ان منظومات کا ایک خاصہ تو یہی ہے کہ ان میں وقت کی پرچھائیں کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ لہجے کی کھنک، الفاظ کا بانکپن، رعنائی خیال اور وفور جذب و شوق جس پہلو سے دیکھئے آج کے کیفی وہی کیفی ہیں جنھیں ہم اور آپ پچیس برس سے جانتے ہیں۔ اپنے شاعرانہ مقام کے اعتبار سے اب وہ جوان اور نوجوان شعراء کی صف سے نکل کر بزرگانِ سخن کے دائرے میں شامل ہو چکے ہیں لیکن بزرگی کے ساتھ "مضمحل ہو گئے قویٰ غالب" کا جو تصور وابستہ ہے اس کا کوئی شائبہ کیفی کے کلام میں نہیں ملتا صرف اتنا ہے کہ اب اس میں آرائش خم کاکل کا بیان کم ہے اور اندیشہ ہائے دور دراز سے رغبت زیادہ۔

بنیادی طور سے کیفی کی شاعری کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے لیکن غنائیہ شاعری کے سطحی تکلفات اور مصنوعی زیبائشوں سے کیفی نے بہت کم سروکار رکھا ہے۔ غمِ جاناں کا ذکر ہو کہ غمِ دوراں کا 'بوسۂ لب' کی بات ہو کہ بوسۂ زنجیر کی' کیفی بات ہمیشہ کھری کرتے ہیں۔ جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گردوپیش موجود ہے اسی کی بے کم و کاست منظر کشی کیفی کا مسلکِ شعر ہے۔ نہ تلخیِ مضمون سے گھبراتے ہیں نہ تلخیِ کلام سے گریز کرتے ہیں، نہ زہر کو قند بنا کر پیش کرنے کے قائل ہیں نہ قند کی حقیقت سے انکاری اور اس کے باوجود کیفی کی شاعری زہر اور قند کا ملغوبہ نہیں ہے بلکہ ایک متوازن نکھرے ہوئے درد مند فکر انگیز اور حساس نظریۂ حیات و فن کا بلیغ اظہار ہے جس میں کوئی جھول اور کوئی تضاد مشکل ہی سے دکھائی دے گا۔

طولِ کلام کے نہ کیفی قائل ہیں نہ میں ہوں۔ تعارف کے وہ محتاج نہیں اور تنقید کے لیے دفتر درکار ہے۔ یہ چند حروف تو محض اظہارِ خلوص کے لیے لکھ رہا ہوں اس لیے کہ میری نظر میں کیفی ایک عزیز دوست ہونے کے علاوہ ہمارے دور کے نمائندہ اور باکمال شاعرانہ مفسروں میں سے ہیں۔

ماسکو
۱۳ر ستمبر ۱۹۷۲ء

فیض احمد فیض

دو چار باتیں

آوارہ سجدے میری نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ دوسرا مجموعہ آخرِ شب ۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک مصنف کی دو کتابوں کے درمیان یہ وقفہ بہت طویل ہے جب کہ اس وقفے میں ہوا بہت کچھ اچھا بھی برا بھی۔ ہندوستان آزاد بھی ہوا تقسیم بھی۔ اس کے پڑوس میں ایک نیا ملک پاکستان بنا بھی اس سے ان بن بھی ہو گئی، ہندوستان پاکستان دونوں طرف انسانی خون میں تیراکی کا میلہ لگا۔ مشرق جو دیوتاؤں اور پیغمبروں کا وطن کہلاتا ہے اس نے روحانیت کا لبادہ اتار پھینکا اور برہنہ ہو کے انسانی لاشوں پر ناچنے لگا۔ چین میں عوامی انقلاب ہوا، روس نے نازی فتنہ کو کچل کر طاقت کے اعتبار سے بھی دنیا پر اپنی برتری ثابت کر دی۔ اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کمیونسٹ اکائی ٹوٹ گئی میرے سجدے آوارہ ہو گئے۔

○

اس طویل وقفے کے بعد جو مجموعۂ کلام شائع ہوا اسے خاصہ فربہ ہونا چاہیے لیکن آوارہ سجدے ایسا نہیں ہے۔ یہ خاصا فربہ ہو سکتا تھا اگر میں وہ تمام نظمیں اور غزلیں اس میں شامل کر دیتا جو آخرِ شب کے بعد میں نے کہی اور مشاعروں میں سنائی ہیں لیکن میں نے ان میں سے صرف ان نظموں اور غزلوں کا انتخاب کیا جو مجھے کسی وجہ سے پسند ہیں۔ اس مجموعے کی ضخامت بڑھانے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ اس میں جھنکار اور آخرِ شب کی کچھ نظمیں شامل کر دیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس قدر مختصر مجموعہ شائع کرنے کی ترغیب مجھ کو غالب سے ملی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آوارہ سجدے کو دیوانِ غالب سمجھ رہا ہوں، میں نے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی مجموعۂ کلام کا مختصر ہونا اس کا عیب نہیں ہے۔ نکتہ چینی کرنے والوں نے تو غالب کو بھی نہیں بخشا تھا:

ڈیڑھ مجو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالبؔ آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

(اُستاد اوج)

جھنکار سے آوارہ بجدے تک میری شاعری نے جو فاصلہ طے کیا ہے اس میں وہ مسلسل بدلتی اور نئی ہوتی رہی ہے (بہت آہستہ سہی) آج وہ جس موڑ پر ہے اس کا نیا پن بہت واضح ہے۔ یہ رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف کوچ کا موڑ ہے۔ حقیقت پسندی کا یہ رجحان کسی خارجی اثر کا نتیجہ نہیں۔ اس کے آثار جھنکار اور آخرِ شب کی کچھ نظموں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

○

انسان ہمیشہ اپنے ماحول اور ماحول کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتے رہنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ میری شاعری کا موضوع یہی عظیم جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد انفرادی بھی ہوتی ہے اجتماعی بھی، تخلیقی بھی جمالیاتی بھی۔ اس کے آثار دل میں بھی ملتے ہیں بیرونِ دل بھی، جب کسی ملک کے باشعور مزدور سرخ پرچم کے سائے میں منظم اور متحد ہو کر انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو وہ اسی جدوجہد کا ایک رخ ہوتا ہے اور جب ایک شاعر تنہائی میں بیٹھ کر غور و فکر کے معرکے سر کر کے، ایک نظم مکمل کرتا ہے تو اس کا یہ تخلیقی عمل بھی اسی جدوجہد کا ایک غیر محسوس حصہ ہوتا ہے۔ میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ ایک نظم کی تعمیر و تکمیل کے مرحلوں میں میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہوں۔ بلکے بلکے میری شخصیت بدل جاتی ہے۔ شاعری کا ایک منصب شخصیت کی تکمیل بھی ہے۔

○

نئی نسل کے کچھ نقادوں نے میری شاعری کا سب سے بڑا عیب یہ دریافت کیا ہے کہ میری نظمیں مشاعروں میں بہت مقبول ہوتی ہیں اس لیے ان کا گھٹیا ہونا ثابت ہے۔ اگر یہ حضرات اتنا کہہ کے خاموش ہو جاتے تو ان کی بات کی بے مائگی چھپی رہتی لیکن فلسفہ طرازی اور کلیہ سازی کا شوق خاموش رہنے کہاں دیتا ہے اس لیے ان حضرات نے

ایک بھاری بھرکم کلیہ گڑھ کے امریکہ کے ساتویں بیڑے کی طرح میری طرف ڈھکیل دیا کہ شاعری سننے سنانے کی نہیں خاموشی سے لیٹ کے پڑھنے کی چیز ہے۔ اس کے برعکس میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی شاعری کا بہت اہم عنصر ہے۔ جب آپ چپ چاپ لیٹ کے شعر پڑھتے ہیں تو اس کی موسیقی آپ کے دل و دماغ تک پہنچ ہی نہیں پاتی صرف الفاظ ہاتھ آتے ہیں اور صرف الفاظ کا نام شاعری نہیں ہے۔ ہمارا ملک نئے پن کو بڑی مشکل سے قبول کرتا ہے پھر بھی وہ دن دور نہیں جب بازار میں نظموں کی کتابوں کے بجائے شاعروں کے ٹیپ ملا کریں گے۔ اگر میرے سامنے وہ دن آیا تو میں بڑی خوشی سے اس کا استقبال کروں گا۔ اگر شاعروں کا کلام آپ ان کی آواز میں سنیں تو لطف اندوز بھی زیادہ ہوں گے، کلام کی روح تک پہنچنا بھی نسبتاً آسان ہوگا۔

○

چونکہ جھنکار اور آخرِ شب دونوں اب کمیاب ہیں، اس لیے کچھ احباب بہت دنوں سے نیا مجموعہ مرتب اور شائع کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ ان احباب میں مجی شاہد علی خاں کی آواز سب سے اونچی تھی، ایک وقت تو ایسا آ گیا تھا جب میں ان کا سامنا کرتے ہوئے گھبرانے لگا تھا کہ وہ پھر وہی تقاضا کریں گے۔ اس دور میں جب کہ زندگی کے لیے تمام ضروری چیزوں کی طرح ہمارے ملک میں کاغذ بھی نایاب ہے، شاہد علی خاں صاحب میرا یہ مجموعۂ کلام شائع کر کے بڑی سخن نوازی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں شاہد علی خاں صاحب کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں کہ کچھ حق ادا ہو سکے۔

☆☆

کچھ پیش لفظ کے بارے میں

جس دن سے میں نے نظمیں اکٹھا کرنا شروع کی تھیں، اسی دن سے یہ الجھن بھی تھی کہ پیش لفظ لکھنے کی درخواست کس ادیب سے کروں۔ ۲ راگست کو نظمیں شاہد صاحب کے حوالے کر کے میں ۳ راگست کو علاج کی غرض سے ماسکو چلا گیا وہاں مجھے ایرپورٹ پر ہی یہ خبر ملی کہ میرا علاج جس اسپتال میں ہوگا اس میں آج کل فیض احمد فیض بھی ہیں ان کی بیگم صاحب کا علاج ہو رہا ہے۔ مجھے امید تھی کہ یہاں تو فیض صاحب کے پاس وقت ہی وقت ہوگا وہ آسانی سے پیش لفظ لکھ دیں گے۔ مجھے وہاں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ فیض صاحب روس میں بھی اسی حد تک اپنے مداحوں اور پروانوں میں گھرے رہتے ہیں جیسے ہندوستان یا پاکستان میں۔ اس مصروفیت کے باوجود فیض صاحب نے جس خوشی اور محبت سے پیش لفظ لکھنے کے لیے وقت نکال لیا اس کی مجھے اتنی خوشی ہے کہ میں اپنی بیماری کی کوفت بھول گیا۔ اس تجربے کے بعد سے میں اکثر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ فیض صاحب کا دل زیادہ خوبصورت ہے یا ان کی شاعری، غالباً ان کی شاعری اسی لیے اتنی خوبصورت ہے کہ ان کا دل بہت خوبصورت ہے۔ میں فیض صاحب کا رسمی شکریہ ادا کرنا بے ادبی سمجھتا ہوں۔

اس مجموعے کے سلسلے میں مجھے مسز عادل کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے یہ نظمیں جمع کیں اور لکھیں۔ میں اپنے پیارے دوست مہدی کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے کتابت کے بعد مسودہ کو پڑھا اور اس کی تصحیح کی۔

گرد پوش کے ڈیزائن کے لیے میں اپنے عزیز دوست اور مشہور آرٹ ڈائرکٹر منصح کا شکر گذار ہوں۔ اگر اس کتاب میں منصح کا کچھ نہ ہوتا تو یہ کتاب میری نظر سے گر جاتی۔

سنٹرل کلینک ہاسپٹل (ماسکو) — کیفی اعظمی

☆☆

دعوت

کوئی دیتا ہے در دل پہ مسلسل آواز
اور پھر اپنی ہی آواز سے گھبراتا ہے

اپنے بدلے ہوئے انداز کا احساس نہیں
میرے بہکے ہوئے انداز سے گھبراتا ہے

ساز اٹھایا ہے کہ موسم کا تقاضا تھا یہی
کانپتا ہاتھ مگر ساز سے گھبراتا ہے

راز کو ہے کسی ہمراز کی مدت سے تلاش
اور دل صحبت ہمراز سے گھبراتا ہے

شوق یہ ہے کہ اڑے وہ تو زمیں ساتھ اڑے
حوصلہ یہ ہے کہ پرواز سے گھبراتا ہے

تیری تقدیر میں آسائش انجام نہیں
اے کہ تو شورش آغاز سے گھبراتا ہے

کبھی آگے کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہوگا

ذہن کے واسطے سانچے تو نہ ڈھالے گی حیات
ذہن کو آپ ہی ہر سانچے میں ڈھلنا ہوگا

یہ بھی جلنا کوئی جلنا ہے کہ شعلہ نہ دھواں
اب جلا دیں گے زمانے کو جو جلنا ہوگا

راستے گھوم کے سب جاتے ہیں منزل کی طرف
ہم کسی رخ سے چلیں ساتھ ہی چلنا ہوگا

☆

نیا حسن

کتنی رنگیں ہے فضا کتنی حسیں ہے دنیا
کتنا سرشار ہے ذوقِ چمن آرائی آج
اس سلیقے سے سجائی گئی بزمِ گیتی
تو بھی دیوارِ اجنتا سے اتر آئی آج

رونمائی کی یہ ساعت یہ تہی دستیِ شوق
نہ چرا سکتا ہوں آنکھیں نہ ملا سکتا ہوں
پیار سوغات، وفا نذر، محبت تحفہ
یہی دولت ترے قدموں پہ لٹا سکتا ہوں

کب سے تخئیل میں لرزاں تھا یہ نازک پیکر
کب سے خوابوں میں مچلتی تھی جوانی تیری
میرے افسانے کا عنوان بنی جاتی ہے
ڈھل کے سانچے میں حقیقت کے کہانی تیری

مرحلے جھیل کے نکھرا ہے مذاقِ تخلیق
سعیِ پیہم نے دیے ہیں یہ خد و خال تجھے
زندگی چلتی رہی کانٹوں پہ، انگاروں پر
جب ملی اتنی حسیں، اتنی سبک چال تجھے

تیرے قامت میں ہے انساں کی بلندی کا وقار
دخترِ شہر ہے، تہذیب کا شہکار ہے تو
اب نہ جھپکے گی پلک، اب نہ بجھیں گی نظریں
حسن کا میرے لیے آخری معیار ہے تو

یہ ترا پیکرِ سیمیں، یہ گلابی ساری
دستِ محنت نے شفق بن کے اڑھادی تجھ کو
جس سے محروم ہے فطرت کا جمالِ رنگیں
تربیت نے وہ لطافت بھی سکھادی تجھ کو

آگہی نے تری باتوں میں کھلائیں کلیاں
علم نے شکّریں لہجے میں نچوڑے انگور
دل ربائی کا یہ انداز کسے آتا تھا
تو ہے جس سانس میں نزدیک اسی سانس میں دور

یہ لطافت، یہ نزاکت، یہ حیا، یہ شوخی
سو دیے جلتے ہیں اُمڈی ہوئی ظلمت کے خلاف
لبِ شاداب پہ چھلکی ہوئی گلنار ہنسی
اک بغاوت ہے یہ آئینِ جراحت کے خلاف

حوصلے جاگ اٹھے سوزِ یقیں جاگ اٹھا
نگہِ ناز کے بے نام اشاروں کو سلام
تو جہاں رہتی ہے اس ارضِ حسیں پر سجدہ
جن میں تو ملتی ہے ان راہگزاروں کو سلام

آ قریب آ کہ یہ جوڑا میں پریشاں کر دوں
تشنہ کامی کو گھٹاؤں کا پیام آ جائے
جس کے ماتھے سے ابھرتی ہیں ہزاروں صبحیں
میری دنیا میں بھی ایسی کوئی شام آ جائے

☆

ایک بوسہ

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں

پھول کیا، شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں

رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی
مدتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں

پھول کھلنے لگتے ہیں اجڑے اجڑے گلشن میں
پیاسی پیاسی دھرتی پر ابر چھانے لگتے ہیں

لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

☆

۱۹۵۱ء

تلنگانہ

ضعیف مائیں، جوان بہنیں، جھکے ہوئے سر اٹھا رہی ہیں
سلگتی نظروں کی آنچ میں، بھیگی بھیگی پلکیں سکھا رہی ہیں
لہو بھری چولیوں، پھٹے آنچلوں سے پرچم بنا رہی ہیں
ترانۂ جنگ گا رہی ہیں

ذرا پکار دو بے چین نوجوانوں کو
ذرا جھنجھوڑ دو کچلے ہوئے کسانوں کو
ادھر سے قافلۂ انقلاب گزرے گا
بچھا دو سینۂ گیتی پہ آسمانوں کو

سفید پلکوں، کھنچی ہوئی جھریوں میں شعلے مچل پڑے ہیں
جواں نگاہوں، جواں دلوں سے، ہزار طوفاں ابل پڑے ہیں
بھرے ہوئے دامنوں میں پتھروں سے بچے نکل پڑے ہیں
سب ایک ہی سمت چل پڑے ہیں

جلا دو قصرِ حکومت کے سب مکینوں کو
بچا سکیں تو بچالیں وہ شہ نشینوں کو
ترستے رہتے ہیں جو ہاتھ آستیں کے لیے
جلال میں وہ الٹ دیتے ہیں زمینوں کو

چمک رہے ہیں نکیلے شانوں پہ پھاوڑے، بیلچے، کدالیں
اڑا رہی ہیں ہوا میں چنگاریاں تفنگوں کی گرم نالیں
وہ گولیاں بے جھجک لہو میں جو بادشاہوں کے بھی نہالیں
وہ گھونسیں تاج جو گرالیں

یہ جست روس کے میدان نے سکھائی ہے
یہ فوج چین سے ہوتی دکھن میں آئی ہے
وہ اٹھ کھڑے ہوئے دھرنا دیے جو بیٹھے تھے
کہ آج شاہ کے ایوان پہ چڑھائی ہے

یہ شہر یاری، یہ تاج داری، وجود پہ بار ہو گئی ہے
جفا کی خوگر غریب دنیا جفا سے بے زار ہو گئی ہے
زمین ہر چھاؤنی نگلنے پہ آج تیار ہو گئی ہے
کہ بھوک بیدار ہو گئی ہے

نہ صرف خاص کی حد بندیاں نہ جاگیریں
ہر ایک گام پہ ٹوٹی پڑی ہیں زنجیریں
وہ کھیت کون اجاڑے گا کون لوٹے گا
اُگی ہوئی ہیں منڈیروں پہ جن کے شمشیریں

عوام کا اضطراب ہے یہ، عوام کا پیچ و تاب ہے یہ
ستم سے دبنا ہے غیر ممکن، کہ ہر ستم کا جواب ہے یہ
سمجھتے ہو ستیہ گرہ اس کو، زندگی کا عتاب ہے یہ
جھکا دو سر انقلاب ہے یہ

کہاں جہاد، کہاں جدو جہد کی منزل
مفاہمت نہیں پاتی جہاد کا حاصل
ہوائے تند نے گوندھی ہے زلفِ آزادی
بغاوتوں نے نکھارا ہے حسنِ مستقبل

حیات انگڑائی لے کے اپنا نظام اب خود سنبھالتی ہے
جلی ہوئی بستیوں پہ تعمیر عکس شہروں کا ڈالتی ہے
روش روش کو شگوفہ کاری چمن کے سانچے میں ڈھالتی ہے
کلی کلی رنگ اچھالتی ہے

لہو سے سینۂ گیتی کے داغ دھوئے ہیں
جگا کے خاک کی قسمت، شہید سوئے ہیں
کہیں کی فوج سہی اس طرف کا رخ نہ کرے
یہاں زمین میں بم من چلوں نے بوئے ہیں

ابھرتی انسانیت کی توہین ہے تشدد کی حکمرانی
جبینِ تاریخ پر ہے اک داغ آج کی مطلق العنانی
تمہارے ہمراہ فتح و نصرت، تمہارے قدموں میں کامرانی
مجاہدو! وہ ہے راج دھانی

☆

۱۹۳۸ء

آندھیاں توڑ لیا کرتی تھیں شمعوں کی لویں
جڑ دیے اس لیے بجلی کے ستارے ہم نے
بن گیا قصر تو پہرے پہ کوئی بیٹھ گیا
سو رہے خاک پہ ہم شورشِ تعمیر لیے

اپنی نس نس میں لیے محنتِ پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لیے
دن پگھلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لیے

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائیگی

☆

۱۹۶۳ء

مکان

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائیگی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اُتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند
بام و در اور، ذرا اور سنوارے ہم نے

آوارہ سجدے

(کمیونسٹ اکائی کے ٹوٹنے پر)

اک یہی سوزِ نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوزِ نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سرِ مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں
تم بھی محبوب مرے، تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں
ختم ہے تم پہ مسیحا نفسی، چارہ گری
محرمِ دردِ جگر تم بھی نہیں تم بھی نہیں
اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں
دور منزل تھی، مگر ایسی بھی کچھ دور نہ تھی
لے کے پھرتی رہی رستے ہی میں وحشت مجھ کو
ایک زخم ایسا نہ کھایا کہ بہار آجاتی
دار تک لے کے گیا شوقِ شہادت مجھ کو

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور میرا راہ نما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آکے خدا کوئی نہیں

۱۹۶۳ء

☆

نہرو

میں نے تنہا کبھی اس کو دیکھا نہیں
پھر بھی جب اس کو دیکھا وہ تنہا ملا
جیسے صحرا میں چشمہ کہیں
یا سمندر میں مینار نور
یا کوئی فکر اوہام میں
فکر صدیوں اکیلی اکیلی رہی
ذہن صدیوں اکیلا اکیلا ملا

اور اکیلا اکیلا بھٹکتا رہا
ہر نئے ہر پرانے زمانے میں وہ
بے زباں تیرگی میں کبھی
اور کبھی چلچلاتی دھوپ میں
چاندنی میں کبھی خواب کی
اس کی تقدیر تھی اک مسلسل تلاش
خود کو ڈھونڈا کیا ہر فسانے میں وہ

بوجھ سے اپنے اس کی کمر جھک گئی
قد مگر اور کچھ اور بڑھتا رہا
خیر و شر کی کوئی جنگ ہو

زندگی کا ہو کوئی جہاد
وہ ہمیشہ ہوا سب سے پہلے شہید
سب سے پہلے وہ سولی پہ چڑھتا رہا

جن تقاضوں نے اس کو دیا تھا جنم
ان کی آغوش میں پھر سمایا نہ وہ
خون میں وید گونجے ہوئے
اور جبیں پہ فروزاں اذاں
اور سینے پہ رقصاں صلیب
بے جھجک سب کے قابو میں آیا نہ وہ

ہاتھ میں اس کے کیا تھا جو دیتا ہمیں
صرف اک کیل، اس کیل کا اک نشاں
نشہ سے کوئی چیز ہے
اک گھڑی دو گھڑی ایک رات
اور حاصل وہی درد سر
اس نے زنداں میں لیکن پیا تھا جو زہر
اٹھ کے سینے سے بیٹھا نہ اس کا دھواں

☆

مئی ۱۹۶۴ء

نہرو

میں نے تنہا کبھی اس کو دیکھا نہیں
پھر بھی جب اس کو دیکھا وہ تنہا ملا
جیسے صحرا میں چشمہ کہیں
یا سمندر میں مینار نور
یا کوئی فکر اوہام میں
فکر صدیوں اکیلی اکیلی رہی
ذہن صدیوں اکیلا اکیلا ملا

اور اکیلا اکیلا بھٹکتا رہا
ہر نئے ہر پرانے زمانے میں وہ
بے زباں تیرگی میں کبھی
اور کبھی چلچلاتی دھوپ میں
چاندنی میں کبھی خواب کی
اس کی تقدیر تھی اک مسلسل تلاش
خود کو ڈھونڈا کیا ہر فسانے میں وہ

بوجھ سے اپنے اس کی کمر جھک گئی
قد مگر اور کچھ اور بڑھتا رہا
خیر و شر کی کوئی جنگ ہو

زندگی کا ہو کوئی جہاد
وہ ہمیشہ ہوا سب سے پہلے شہید
سب سے پہلے وہ سولی پہ چڑھتا رہا

جن تقاضوں نے اس کو دیا تھا جنم
ان کی آغوش میں پھر سمایا نہ وہ
خون میں وید گونجے ہوئے
اور جبیں پہ فروزاں اذاں
اور سینے پہ رقصاں صلیب
بے جھجک سب کے قابو میں آیا نہ وہ

ہاتھ میں اس کے کیا تھا جو دیتا ہمیں
صرف اک کیل، اس کیل کا اک نشاں
نشہ مے کوئی چیز ہے
اک گھڑی دو گھڑی ایک رات
اور حاصل وہی دردِ سر
اس نے زنداں میں لیکن پیا تھا جو زہر
اٹھ کے سینے سے بیٹھا نہ اس کا دھواں

☆

مئی ۱۹۶۴ء

عادت

مدتوں میں اک اندھے کنوئیں میں اسیر
سر پٹکتا رہا، گڑگڑاتا رہا
روشنی چاہیے، چاندنی چاہیے، زندگی چاہیے
روشنی پیار کی، چاندنی یار کی، زندگی دار کی

اپنی آواز سنتا رہا رات دن
دھیرے دھیرے یقیں دل کو آتا رہا
سونے سنسار میں
بے وفا یار میں
دامن دار میں
روشنی بھی نہیں
چاندنی بھی نہیں
زندگی بھی نہیں
زندگی ایک رات
واہمہ کائنات
آدمی بے ثبات
لوگ کوتاہ قد
شہر شہر حسد
گاؤں ان سے بھی بد

ان اندھیروں نے جب پیس ڈالا مجھے
پھر اچانک کنوئیں نے اچھالا مجھے
اپنے سینے سے باہر نکالا مجھے
سیکڑوں مصر تھے سامنے
سیکڑوں اس کے بازار تھے
ایک بوڑھی زلیخا نہیں
جانے کتنے خریدار تھے
بڑھتا جاتا تھا یوسف کا مول
لوگ بکنے کو تیار تھے

کھل گئے مہ جبینوں کے سر
ریشمی چادریں ہٹ گئیں
پلکیں جھپکیں نہ نظریں جھکیں
مرمریں انگلیاں کٹ گئیں
ہاتھ دامن تک آیا کوئی
دھجیاں دور تک بٹ گئیں

میں نے ڈر کے لگادی کنوئیں میں چھلانگ
سر پٹکنے لگا پھر اسی کرب سے
پھر اسی درد سے گڑگڑانے لگا
روشنی چاہیے، چاندنی چاہیے، زندگی چاہیے

☆

۱۹۶۵ء

دائرہ

روز بڑھتا ہوں جہاں سے آگے
پھر وہیں لوٹ کے آجاتا ہوں
بارہا توڑ چکا ہوں جن کو
انہیں دیواروں سے ٹکراتا ہوں
روز بستے ہیں کئی شہر نئے
روز دھرتی میں سما جاتے ہیں
زلزلوں میں تھی ذرا سی گرمی
وہ بھی اب روز ہی آجاتے ہیں

جسم سے روح تلک ریت ہی ریت
نہ کہیں دھوپ، نہ سایہ، نہ سراب
کتنے ارمان ہیں کس صحرا میں
کون رکھتا ہے مزاروں کا حساب
نبض بجھتی بھی بھڑکتی بھی ہے
دل کا معمول ہے گھبرانا بھی
رات اندھیرے نے اندھیرے سے کہا
ایک عادت ہے جیئے جانا بھی

قوس اک رنگ کی ہوتی ہے طلوع
ایک ہی چال بھی پیمانے کی
گوشے گوشے میں کھڑی ہے بیسی
شکل کیا ہو گئی میخانے کی
کوئی کہتا تھا سمندر ہوں میں
اور مری جیب میں قطرہ بھی نہیں
خیریت اپنی لکھا کرتا ہوں
اب تو تقدیر میں خطرہ بھی نہیں
اپنے ہاتھوں کو پڑھا کرتا ہوں
کبھی قرآں، کبھی گیتا کی طرح
چند ریکھاؤں میں سیماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح
رام کب لوٹیں گے، معلوم نہیں
کاش راون ہی کوئی آجاتا

☆

۱۹۶۵ء

ابنِ مریم

تم خدا ہو
خدا کے بیٹے ہو
یا فقط امن کے پیمبر ہو
یا کسی کا حسیں تخیل ہو
جو بھی ہو مجھ کو اچھے لگتے ہو
مجھ کو سچے لگتے ہو

اس ستارے میں، جس میں صدیوں کے
جھوٹ اور کذب کا اندھیرا ہے
اس ستارے میں، جس کو ہر رخ سے
رینگتی سرحدوں نے گھیرا ہے
اس ستارے میں، جس کی آبادی
امن بوتی ہے جنگ کاٹتی ہے
رات پیتی ہے نور مکھڑوں کا
صبح سینوں کا خون چاٹتی ہے
تم نہ ہوتے تو جانے کیا ہوتا

تم نہ ہوتے تو اس ستارے میں
دیوتا، راکشس، غلام، امام
پارسا، رند، راہبر، رہزن
برہمن، شیخ، پادری، بھکشو
سبھی ہوتے مگر ہمارے لیے
کون چڑھتا خوشی سے سولی پر

جھونپڑوں میں گھرا یہ ویرانہ
مچھلیاں دن میں سوکھتی ہیں جہاں
بلیاں دور بیٹھی رہتی ہیں
اور خارش زدہ سے کچھ کتے
لیٹے رہتے ہیں بے نیازانہ
دم مروڑے کہ کوئی سر کچلے
کاٹنا کیا وہ بھونکتے بھی نہیں

اور جب وہ دہکتا انگارہ
چھن سے ساگر میں ڈوب جاتا ہے
تیرگی اوڑھ لیتی ہے دنیا
کشتیاں کچھ کنارے آتی ہیں

بھنگ، گانجا، چرس، شراب، افیون
جو بھی لائیں، جہاں سے بھی لائیں
دوڑتے ہیں ادھر سے کچھ سائے
اور سب کچھ اتار لاتے ہیں

گاڑی جاتی ہے عدل کی میزان
جس کا حصہ اسی کو ملتا ہے
یہاں خطرہ نہیں خیانت کا
تم یہاں کیوں کھڑے ہو مدت سے
یہ تمہاری تھکی تھکی بھیڑیں
رات جن کو زمیں کے سینے پہ
صبح ہوتے انڈیل دیتی ہے
منڈیوں، دفتروں، ملوں کی طرف
ہانک دیتی، دھکیل دیتی ہے
راستے میں یہ رک نہیں سکتیں
توڑ کے گھٹنے جھک نہیں سکتیں
ان سے تم کیا توقع رکھتے ہو
بھیڑیا ان کے ساتھ چلتا ہے

تکتے رہتے ہو اس سڑک کی طرف
دفن جس میں کئی کہانیاں ہیں
دفن جس میں کئی جوانیاں ہیں
جس پہ اک ساتھ بھاگی پھرتی ہیں
خالی جیبیں بھی اور تجوریاں بھی
جانے کس کا ہے انتظار تمہیں

مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
جس کو کوڑوں کی چھاؤں میں دنیا
بیچتی بھی خریدتی بھی تھی

مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
جس کو کھیتوں سے ایسے باندھا تھا
جیسے میں ان کا ایک حصہ تھا
کھیت بکتے تو میں بھی بکتا تھا

مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
کچھ مشینیں بنائیں جب میں نے
ان مشینوں کے مالکوں نے مجھے

بے جھجک ان میں ایسے جھونک دیا
جیسے میں کچھ نہیں ہوں ایندھن ہوں
مجھ کو دیکھو کہ میں تھکا ہارا
پھر رہا ہوں یگوں سے آوارا
تم یہاں سے ہٹو تو آج کی رات
سو رہوں میں اسی چبوترے پہ
تم یہاں سے ہٹو خدا کے لیے

جاؤ وہ ویت نام کے جنگل
اس کے مصلوب شہر زخمی گاؤں
جن کو انجیل پڑھنے والوں نے
روند ڈالا ہے پھونک ڈالا ہے
جانے کب سے پکارتے ہیں تمھیں

جاؤ اک بار پھر ہمارے لیے
تم کو چڑھنا پڑے گا سولی پہ

☆

۱۹۶۵ء

دوپہر

یہ جیت ہار تو اس دور کا مقدر ہے
یہ دور جو کہ پرانا نہیں نیا بھی نہیں
یہ دور جو کہ سزا بھی نہیں جزا بھی نہیں
یہ دور جس کا بظاہر کوئی خدا بھی نہیں
تمھاری جیت اہم ہے نہ میری ہار اہم
کہ ابتدا بھی نہیں ہے یہ انتہا بھی نہیں
شروع معرکۂ جاں ابھی ہوا بھی نہیں
شروع ہو تو یہ ہنگام فیصلہ بھی نہیں
پیام زیرِ لب اب تک ہے صورِ اسرافیل
سنا کسی نے کسی نے ابھی سنا بھی نہیں
کیا کسی نے کسی نے یقیں کیا بھی نہیں
اٹھا زمیں سے کوئی، کوئی اٹھا بھی نہیں
یہ کارواں ہے تو انجامِ کارواں معلوم
کہ اجنبی بھی نہیں کوئی آشنا بھی نہیں
کسی سے خوش بھی نہیں ہے کوئی خفا بھی نہیں
کسی کا حال کوئی مڑ کے پوچھتا بھی نہیں

☆

بہُروپنی

ایک گردن پہ سیکڑوں چہرے
اور ہر چہرے پہ ہزاروں داغ
اور ہر داغ بند دروازہ
روشنی ان سے آ نہیں سکتی
روشنی اِن سے جا نہیں سکتی

تنگ سینہ ہے حوض مسجد کا
دل وہ دونا پُجاریوں کے بعد
چاٹتے رہتے ہیں جسے کُتّے
کُتّے دونا جو چاٹ لیتے ہیں
دیوتاؤں کو کاٹ لیتے ہیں

جانے کِس کوکھ نے جنا اِس کو
جانے کِس صحن میں جوان ہوئی
جانے کِس دیس سے چلی کمبخت
ویسے یہ ہر زبان بولتی ہے
زخم کھڑکی کی طرح کھولتی ہے

اور کہتی ہے جھانک کر دل میں
تیرا مذہب، ترا عظیم خدا
تیری تہذیب کے حسین صنم
سب کو خطرے نے آج گھیرا ہے
بعد اُن کے جہاں اندھیرا ہے

سرد ہوجاتا ہے لہو میرا
بند ہوجاتی ہیں کھُلی آنکھیں
ایسا لگتا ہے جیسے دُنیا میں
سبھی دُشمن ہیں کوئی دوست نہیں
مجھ کو زندہ نگل رہی ہے زمیں

ایسا لگتا ہے راکھشس کوئی
ایک گاگر کمر میں لٹکا کر
آسماں پر چڑھے گا آخرِ شب
نور سارا نچوڑ لائے گا
میرے تارے بھی توڑ لائے گا

یہ جو دھرتی کا پھٹ گیا سینہ
اور باہر نکل پڑے ہیں جلوس
مجھ سے کہتے ہیں تم ہمارے ہو
میں اگر ان کا ہوں تو میں کیا ہوں
میں کسی کا نہیں ہوں اپنا ہوں

مجھ کو تنہائی نے دیا ہے جنم
میرا سب کچھ اکیلے پن سے ہے
کون پوچھے گا مجھ کو میلے میں
ساتھ جس دن قدم بڑھاؤں گا
چال میں اپنی بھول جاؤں گا

یہ اور ایسے ہی چند اور سوال
ڈھونڈنے پر بھی آج تک مجھ کو
جن کے ماں باپ کا ملا نہ سراغ
ذہن میں یہ انڈیل دیتی ہے
مجھ کو مٹھی میں بھینچ لیتی ہے

چاہتا ہوں کہ قتل کر دوں اسے
وار لیکن جب اس پہ کرتا ہوں
میرے سینے پہ زخم ابھرتے ہیں
میرے ماتھے سے خوں ٹپکتا ہے
جانے کیا میرا اس کا رشتہ ہے

آندھیوں میں اذان دی میں نے
سنکھ پھونکا اندھیری راتوں میں
گھر کے باہر صلیب لٹکائی
ایک اک در سے اس کو ٹھکرایا
شہر سے دور جاکے پھینک آیا

اور اعلان کر دیا کہ اٹھو
برف سی جم گئی ہے سینوں میں
گرم بوسوں سے اس کو پگھلا دو
کر لو جو بھی گناہ وہ کم ہے
آج کی رات جشن آدم ہے

یہ مری آستیں سے نکلی
رکھ دیا دوڑ کے چراغ پہ ہاتھ
مل دیا پھر اندھیرا چہرے پہ
ہونٹ سے دل کی بات لوٹ گئی
در تک آ کے برات لوٹ گئی

اس نے مجھ کو الگ بلا کے کہا
آج کی زندگی کا نام ہے خوف
خوف ہی وہ زمین ہے جس میں
فرقے اُگتے ہیں، فرقے پلتے ہیں
دھارے ساگر سے کٹ کے چلتے ہیں

خوف جب تک دلوں میں باقی ہے
صرف چہرہ بدلتے رہنا ہے
صرف لہجہ بدلتے رہنا ہے
کوئی مجھ کو مٹا نہیں سکتا
جشن آدم منا نہیں سکتا

☆

نذرانہ

تم پریشان نہ ہو، بابِ کرم وا نہ کرو
اور کچھ دیر پکاروں گا چلا جاؤں گا
اسی کوچے میں جہاں چاند اُگا کرتے ہیں
شبِ تاریک گزاروں گا، چلا جاؤں گا

راستہ بھول گیا، یا یہی منزل ہے مری
کوئی لایا ہے کہ خود آیا ہوں معلوم نہیں
کہتے ہیں حسن کی نظریں بھی حسیں ہوتی ہیں
میں بھی کچھ لایا ہوں، کیا لایا ہوں معلوم نہیں

یوں تو جو کچھ تھا مرے پاس میں سب بیچ آیا
کہیں انعام ملا، اور کہیں قیمت بھی نہیں
کچھ تمھارے لیے آنکھوں میں چھپا رکھا ہے
دیکھ لو اور نہ دیکھو تو شکایت بھی نہیں

ایک تو اتنی حسیں دوسرے یہ آرائش
جو نظر پڑتی ہے چہرے پہ ٹھہر جاتی ہے
مسکرا دیتی ہو رسماً بھی اگر محفل میں
اک دھنک ٹوٹ کے سینوں میں بکھر جاتی ہے

گرم بوسوں سے تراشا ہوا نازک پیکر
جس کی اک آنچ سے ہر روح پگھل جاتی ہے
میں نے سوچا ہے تو سب سوچتے ہوں گے شاید
پیاس اس طرح بھی کیا سانچے میں ڈھل جاتی ہے

کیا کمی ہے جو کرو گی مرا نذرانہ قبول
چاہنے والے بہت، چاہ کے افسانے بہت
ایک ہی رات سہی گرمیِ ہنگامۂ عشق
ایک ہی رات میں جل مرتے ہیں پروانے بہت

پھر بھی اک رات میں سو طرح کے موڑ آتے ہیں
کاش تم کو کبھی تنہائی کا احساس نہ ہو
کاش ایسا نہ ہو گھیرے رہے دنیا تم کو
اور اس طرح کہ جس طرح کوئی پاس نہ ہو

آج کی رات جو میری ہی طرح تنہا ہے
میں کسی طرح گزاروں گا چلا جاؤں گا
تم پریشان نہ ہو، بابِ کرم وا نہ کرو
اور کچھ دیر پکاروں گا چلا جاؤں گا

☆

غزل

سنا کرو مری جاں ان سے اُن سے افسانے
سب اجنبی ہیں یہاں کون کس کو پہچانے

یہاں سے جلد گزر جاؤ قافلے والو!
ہیں میری پیاس کے پھونکے ہوئے یہ ویرانے

مرے جنون پرستش سے تنگ آ گئے لوگ
سنا ہے بند کیے جا رہے ہیں بت خانے

جہاں سے پچھلے پہر کوئی تشنہ کام اٹھا
وہیں پہ توڑے ہیں یاروں نے آج پیمانے

بہار آئے تو میرا سلام کہہ دینا
مجھے تو آج طلب کر لیا ہے صحرا نے

ہوا ہے حکم کہ کیفیؔ کو سنگسار کرو
مسیح بیٹھے ہیں چھپ کے کہاں خدا جانے

☆

غزل

پتھر کے خدا وہاں بھی پائے
ہم چاند سے آج لوٹ آئے

دیواریں تو ہر طرف کھڑی ہیں
کیا ہوگئے مہربان سائے

جنگل کی ہوائیں آ رہی ہیں
کاغذ کا یہ شہر اڑ نہ جائے

لیلیٰ نے نیا جنم لیا ہے
ہے قیس کوئی جو دل لگائے

ہے آج زمیں کا غسل صحت
جس دل میں ہو جتنا خون لائے

صحرا صحرا لہو کے خیمے
پھر پیاسے لب فرات آئے

☆

دوسرا طوفان

اور پھر ایک رات ایسی آئی
میکدے بجھ گئے
سارے آتش کدے بجھ گئے
میکدوں اور آتش کدوں کا رقیب
اک مجاہد ادیب
زندگی کے لیے
جو ہمیشہ مشیت سے لڑتا رہا
آدمی کے لیے
جو خدا کا گریباں پکڑتا رہا
لڑتے لڑتے وہ اک روز چپ ہوگیا
اپنے ہی اک صحیفے سے منھ ڈھانپ کے
سو گیا
لیکن اس کا قلم
جس کے سو نام ہیں
جس کے سو کام ہیں
لڑ رہا ہے اسی ڈھنگ سے آج تک
چل رہا ہے اسی رنگ سے آج تک

گاڑ دو اس ہاتھ میں
گاڑ دو اس ہاتھ میں
چلتے چلتے کئی انگلیاں مڑ گئیں
اور کئی انگلیوں نے بنیں
نت نئی سازشیں
نت نئی رسیاں
اور پھر اس کو سولی پہ لٹکا دیا
عرش سے کوئی پیغام آیا نہیں
آسمانوں پہ اس کو بلایا نہیں
اس کی ٹوٹی ہوئی پسلیوں سے مگر
اس طرح خون رسنے ٹپکنے لگا
رسیاں جل گئیں
سازشیں گل گئیں
نوح کے عہد کا یہ فسانہ نہیں
آج کی بات ہے
اس نے نوکِ زباں پر سمندر اٹھایا
اٹھا کر فضاؤں میں پھیلا دیا
کرۂ ارض کو لے کے منقار میں

یوں اچھالا خلاؤں میں لٹکا دیا
دشت و در کانپ اٹھے
بحر و بر کانپ اٹھے
بے خبر کانپ اٹھے
باخبر کانپ اٹھے
یہ وہ طوفاں نہیں ڈوب جاتی ہے جس میں
زمیں
اس میں ڈوبی زمینیں ابھر آتی ہیں

☆

مارچ ۱۹۶۸ء

پہرہ

عزم کا کوہِ گراں درد کی دیوار ہیں ہم
زخم کا زخم ہیں تلوار کی تلوار ہیں ہم
جیسے جھپکی نہیں صدیوں سے یہ بوجھل پلکیں
آج کی رات کچھ اس طرح سے بیدار ہیں ہم
جال سرحد سے اٹھا جال بچھانے والے

جب ملی آنکھ ملی موت کا نذرانہ لیے
جب بے ہونٹ ملے زہر کا پیمانہ لیے
خون بہتا ہے تو بن جاتی ہے تصویر تری
جنگ اس ہاتھ میں اس ہاتھ میں ویرانہ لیے
تجھ سا دیکھا نہ سنا خون بہانے والے

زندگی تیرے تصور سے بھی گھبراتی ہے
اتنا نزدیک نہ آ سانس گھٹی جاتی ہے
تو نے سونے کے کٹورے میں یہ کیا شے پی لی
گرم سانسوں سے ترے خون کی بو آتی ہے
منہ اُدھر پھیر ذرا پیار جتانے والے

تیرا احسان جو لیں اپنی بہاریں بھولیں
کھیت میں قحط آ گئیں باغ میں نکہت بھولیں
پیاس بن جائے مقدر جو پئیں تیری شراب
آبلے ہاتھ میں پڑ جائیں جو ساغر چھو لیں
یہ رہا جام ترا زہر پلانے والے

قسمتیں بن کے ترے دم سے بگڑ جاتی ہیں
بستیاں دل کی طرح بس کے اجڑ جاتی ہیں
تیل پی لیتی ہے آنسو کی طرح زر کے زمیں
منڈیاں تیری بھنک پا کے سکڑ جاتی ہیں
سکہ کھوٹا ہے ترا داؤں لگانے والے

نرم شاخوں نے لچکنے کی سزا پائی ہے
ایک ایک پھول کو ترسا کے بہار آئی ہے
تارے اترے ہیں زمیں پر کہ کھلا ہے بیلا
ڈھاک پھولا ہے کہ شعلوں کی گھٹا چھائی ہے
ہے بہت گرم فضا شاخ جھکانے والے

ہم وہ راہی ہیں جو منزل کی خبر رکھتے ہیں
پاؤں کانٹوں پہ شگوفوں پہ نظر رکھتے ہیں
کتنی راتوں سے نچوڑا ہے اجالا ہم نے
رات کی قبر پہ بنیادِ سحر رکھتے ہیں
او اندھیرے کے خدا شمع بجھانے والے

۱۹۶۹ء

پیار کا جشن

پیار کا جشن نئی طرح منانا ہوگا
غم کسی دل میں سہی غم کو مٹانا ہوگا

کانپتے ہونٹوں پہ پیمانِ وفا کیا کہنا
تجھ کو لائی ہے کہاں لغزشِ پا کیا کہنا
میرے گھر میں ترے مکھڑے کی ضیا کیا کہنا
آج ہر گھر کا دیا مجھ کو جلانا ہوگا

روح چہروں پہ دھواں دیکھ کر شرماتی ہے
جھینپی جھینپی سی مرے لب پہ ہنسی آتی ہے
تیرے ملنے کی خوشی درد بنی جاتی ہے
ہم کو ہنسنا ہے تو اوروں کو ہنسانا ہوگا

سوئی سوئی ہوئی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے جام
کھوئی کھوئی ہوئی نظروں میں محبت کا پیام
لبِ شیریں پہ مری تشنہ لبی کا انعام
جانے انعام ملے گا کہ چرانا ہوگا

میری گردن میں تری صندلی باہوں کا یہ ہار
ابھی آنسو تھے ان آنکھوں میں ابھی اتنا خمار
میں نہ کہتا تھا مرے گھر میں بھی آئے گی بہار
شرط اتنی تھی کہ پہلے تجھے آنا ہوگا

☆

اجنبی

اے ہمہ رنگ ہمہ نور ہمہ سوز و گداز
بزمِ مہتاب سے آنے کی ضرورت کیا تھی
تو جہاں تھی اسی جنت میں نکھرتا ترا روپ
اس جہنم کو بسانے کی ضرورت کیا تھی

یہ خد و خال یہ خوابوں سے تراشا ہوا جسم
اور دل جس پہ خد و خال کی نرمی بھی نثار
خار ہی خار شرارے ہی شرارے ہیں یہاں
اور تھم تھم کے اٹھا پاؤں بہاروں کی بہار

تشنگی زہر بھی پی جاتی ہے امرت کی طرح
جانے کس جام پہ رک جائے نگاہِ معصوم
ڈوبتے دیکھا ہے جن آنکھوں میں میخانہ بھی
پیاس ان آنکھوں کی بجھے یا نہ بجھے کیا معلوم

ہیں کبھی حسن پرست اہلِ نظر صاحبِ دل
کوئی گھر میں کوئی محفل میں سجائے گا تجھے
تو فقط جسم نہیں شعر بھی ہے گیت بھی ہے
کون اشکوں کی گھنی چھاؤں میں گائے گا تجھے

تجھ سے اک درد کا رشتہ بھی ہے بس پیار نہیں
اپنے آنچل پہ مجھے اشک بہا لینے دے
تو جہاں جاتی ہے جا روکنے والا میں کون
اپنے رستے میں مگر شمع جلا لینے دے

☆

تاشقند

بھٹکتا ہوا شوق کا کارواں
ہوا خیمہ زن آ کے دیکھو کہاں
یہ عاشق کے سینے سے چوڑی زمیں
سما جائیں جس میں کئی آسماں

کہاں باغِ جنت کہاں تاشقند
یہ زندہ حقیقت وہ مُردہ گماں
یہ نشہ ہی نشہ ہے اور وہ خمار
یہ شعلہ ہی شعلہ ہے اور وہ دھواں

درخت اس کے سارے مسافر نواز
پہاڑ اس کے سب مشفق و مہرباں
عزیزوں کی محفل مہکتے چمن
رفیقوں کی مجلس حسیں وادیاں

ہر اک باب اس کا تو اک شعر
کہیں سے بیاں کیجئے داستاں
یہیں حسن اترا تھا پہلے پہل
یہیں عشق اک دن ہوا تھا جواں

اسی سے بہاریں نچوڑی گئیں
کبھی آ گئی تھی ادھر جو خزاں
وہاں تک لہکتے ہیں شاداب کھیت
جہاں بھوک کا کل ملا تھا نشاں

خراماں ہوا اس طرح انقلاب
ہر اک راستہ بن گیا کہکشاں
جبینوں پہ سورج گریباں میں چاند
ستاروں کی گنتی نہیں ہے یہاں

چٹیاں پٹیاں سے ہیں زلزلے
زہے دست تعمیر کی مستیاں
زلیخا پہ آیا دوبارہ شباب
دوبارہ جواں ہو گئیں بستیاں

جل کل مہماں تھے جو کل میزباں
گلے ملتے ہی ہو گئے جسم و جاں
غزل چھیڑ گھونگھرو چھن تاشقند
ترے ساتھ رقصاں ہے ہندوستاں

تاشقند، ۱۹ مئی ۱۹۶۹ء

☆

فرغانہ

یہی تحفہ ہے یہی نذرانہ
میں جو آوارہ نظر لایا ہوں
رنگ میں تیرے ملانے کے لیے
قطرۂ خونِ جگر لایا ہوں
اے گلابوں کے وطن

پہلے کب آیا ہوں کچھ یاد نہیں
لیکن آیا تھا قسم کھاتا ہوں
پھول تو پھول ہیں کانٹوں پہ ترے
اپنے ہونٹوں کے نشاں پاتا ہوں
میرے خوابوں کے وطن

چوم لینے دے مجھے ہاتھ اپنے
جن سے توڑی ہیں کئی زنجیریں
تو نے بدلا ہے مشیت کا مزاج
تو نے لکھی ہیں نئی تقدیریں
انقلابوں کے وطن

پھول کے بعد نئے پھول کھلیں
کبھی خالی نہ ہو دامن تیرا
روشنی روشنی تیری راہیں
چاندنی چاندنی آنگن تیرا
ماہتابوں کے وطن

۲۷ مئی ۱۹۶۹ء

☆

ماسکو

ساتھیو قافلۂ شوق کو روکو تو ذرا
زندگی چار طرف زمزمہ خواں ہے دیکھو
اپنے خوابوں میں جسے ہم نے بسا رکھا تھا
یہ وہی شہر حسیں شہر جواں ہے دیکھو

پرچم امن بلند اور بلند اور بلند
تیرے سائے سے نکل کے میں کہاں جاؤں گا
ماسکو ساز اٹھا ساز اٹھا ساز اٹھا
آج ہر گیت اسی ساز پہ میں گاؤں گا

کیسے خاموش رہوں گا کہ ابھی تک دل میں
پچھلے ہی شور قیامت کی دھمک باقی ہے
میری جھلسی ہوئی یادوں میں گھٹی سانسوں میں
اب بھی بارود کی تھوڑی سی مہک باقی ہے

اب بھی احساس میں کانٹے کی طرح چبھتے ہیں
وہ حسیں پھول جو ہنسنے کو بھی ترسے تھے
آج بھی خون سا رستا ہے مرے گیتوں سے
جس پہ خونخوار فضا سے کبھی بم برسے تھے

کتنے پاگل تھے وہ ایام کہ جن میں خالق
اپنی مخلوق کے اعمال پہ شرمایا تھا
ہیروشیما نے وہ جوڑا ابھی باندھا بھی نہیں
اپنی ہی لاش پہ اک روز جو بکھرایا تھا

جنگ مل سکتی ہے رک سکتی ہے مٹ سکتی ہے
جنگ قسمت ہی سہی دل کا تقاضہ تو نہیں
سب ترے ساتھ ہیں میں میرا وطن میرے رفیق
آج تو جہد کے میدان میں تنہا تو نہیں

اک قدم بھی جو بڑھاتا ہے تو منزل کی طرف
اک دیا اور سر راہ عمل جلتا ہے
تو جو مڑتا ہے تو مڑ جاتی ہے ساری دنیا
تو جو چلتا ہے ترے ساتھ جہاں چلتا ہے

کتنی مشکل سے یہ ٹوٹے ہوئے دل جوڑے ہیں
ان کے ٹکڑوں کو دوبارہ نہ بکھرنے دیں گے
راہیں جاتی ہیں جو مٹنے سے مٹانے تک
ہم ادھر سے کبھی تو بھی نہ گزرنے دیں گے

ماسکو، ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء

☆

گربھ وتی

سن رہا ہوں یہی بے صوت کراہیں کب سے
ہے مگر کرب ہمیشہ سے سوا آج کی رات
نہ تو سویا ہے، نہ سوئے گا خدا آج کی رات

دائی خاموش کھڑی گھول رہی ہے افیون
گھنٹیاں بجتی ہیں، مسجد میں دعا ہوتی ہے
نیند ہی ایسے مریضوں کی دوا ہوتی ہے

پہلے بچے میں ہوا کرتی ہے تکلیف اکثر
آخری ہو کے اٹھا رکھا ہے طوفان اس نے
کر دیا ماں کو بھی، دائی کو بھی ہلکان اس نے

ایسے مولود سے دنیا کا بھلا کیا ہوگا
کلبلانے سے ہمکنے کا ہے انداز جدا
ماں سے انجام جدا، باپ سے آغاز جدا

کوکھ سے اس کی بہر حال پر امید رہیں
کہتے ہیں گربھ وتی اتنی بھی معصوم نہیں
راکشس ہوگا کہ اوتار، یہ معلوم نہیں

اس تذبذب سے نکلے ذہن کو مل جائے نجات
بے اثر ہے جو دوا، کام دعا تو کر جائے
ماں سے کچھ خوف نہیں، کوکھ میں بچہ مر جائے

اور جراح یہ کہتے ہیں کہ یہ پاپ کا پھل
آج اکیلا نہیں مرتا ہے تو ماں بھی مر جائے
اور یہ کشمکشِ سود و زیاں بھی مر جائے

یہ بھی ممکن ہے کہ بچہ جسے ہم سمجھے ہیں
پیٹ کھلنے پہ وہ جلتا ہوا پھوڑا نکلے
خون بہتا ہے بہے، زہر تو تھوڑا نکلے

کچھ دوا سے نہ ہوا ہے، نہ دعا سے ہوگا
میز تیار کرو، گربھ وتی کو لے آؤ
پیٹ کو چاک کرو، کوکھ پہ نشتر برساؤ

کون سا وقت تھا، دن کیسے تھے، ہاں یاد آیا
جنگ اس وقت تھی، اب جنگ کی تیاری ہے
تب سے اب تک وہی منحوس عمل جاری ہے

شل ہوئے جاتے ہیں جراحوں کے دست و بازو
پیٹ میں کٹتی ہے آری، نہ چھری دھنستی ہے
میز پر لیٹی ہوئی، گربھ وتی ہنستی ہے

مدراس، ۱۵ مئی ۱۹۷۰ء

لینن

آسماں اور بھی اوپر کو اٹھا جاتا ہے
تم نے سو سال میں انساں کو کیا کتنا بلند
پشت پر باندھ دیا تھا جنھیں جلادوں نے
پھینکتے ہیں وہی ہاتھ آج ستاروں پہ کمند
دیکھتے ہو کہ نہیں

جگمگا اٹھی ہے محنت کے پسینے سے جبیں
اب کوئی خط، خطِ تقدیر نہیں ہو سکتا
تم کو ہر ملک کی سرحد پہ کھڑے دیکھا ہے
اب کوئی ملک ہو، تسخیر نہیں ہو سکتا

خیر ہو بازوئے قاتل کی، مگر خیر نہیں
آج مقتل میں بہت بھیڑ نظر آتی ہے
کر دیا تھا کبھی ہلکا سا اشارہ جس سمت
ساری دنیا اسی جانب کو مڑی جاتی ہے

حادثہ کتنا کڑا ہے کہ سرِ منزلِ شوق
قافلہ چند گروہوں میں بٹا جاتا ہے
ایک پتھر سے تراشی تھی جو تم نے دیوار
اک خطرناک شگاف اس میں نظر آتا ہے
دیکھتے ہو کہ نہیں

دیکھتے ہو تو کوئی صلح کی تدبیر کرو
ہو سکیں زخم رفو جس سے، وہ تقریر کرو
عہد پیچیدہ مسائل ہیں سوا پیچیدہ
ان کو سلجھاؤ صحیفہ کوئی تحریر کرو

روحیں آوارہ ہیں دے دو انھیں پیکر اپنا
بھر دو ہر پارۂ فولاد میں جوہر اپنا
رونما پھرتے ہیں یا پھرتی ہیں بے سر لاشیں
رکھ دو ہر اکڑی ہوئی لاش پہ تم سر اپنا

صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ۱۹۷۰ء

☆

پیرِ تسمہ پا

میرے کاندھے پہ بیٹھا کوئی
پڑھتا رہتا ہے انجیل و قرآن و وید
مکھیاں کان میں بھنبھناتی ہیں
زخمی ہیں کان
اپنی آواز کیسے سنوں

رانا ہندو تھا اکبر مسلمان تھا
مجھے وہ پہلا انسان تھا
ہستنا پور میں جس نے قبلِ مسیح
ٹیلی وژن بنایا
اور گھر بیٹھے اک اندھے راجہ کو
یدھ کا تماشہ دکھایا

آدمی چاند پر آج اترا تو کیا
یہ ترقی نہیں
اب سے پہلے، بہت پہلے
جب ذرہ ٹوٹا نہ تھا
چشمہ جوہر کا پھوٹا نہ تھا

فرش سے عرش تک جا چکا ہے کوئی
یہ اور ایسی بہت سی جہالت کی باتیں
میرے کاندھے پہ ہوتی ہیں

کاندھے جھکے جا رہے ہیں
قد مرا رات دن گھٹ رہا ہے
سر کہیں پاؤں سے مل نہ جائے

۱۹۷۰ء

☆

غزل

خار و خس تو اٹھیں راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے

چاند سورج بزرگوں کے نقشِ قدم
خیر بجھنے دو ان کو، ہوا تو چلے

حاکمِ شہر، یہ بھی کوئی شہر ہے
مسجدیں بند ہیں، میکدہ تو چلے

اس کو مذہب کہو یا سیاست کہو
خودکشی کا ہنر تم سکھا تو چلے

اتنی لاشیں میں کیسے اٹھا پاؤں گا
آپ اینٹوں کی حرمت بچا تو چلے

بیلچے لاؤ، کھولو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

۱۹۷۰ء

٭

کھلونے

ریت کی ناؤ جھاگ کے مانجھی
کاٹھ کی ریل، سیپ کے ہاتھی
ہلکی بھاری پلاسٹک کی کلیں
موم کے چاک جو رکیں نہ چلیں

راکھ کے کھیت، دھول کے کھلیان
بھاپ کے پیرہن، دھوئیں کے مکان
نیم جادو کی، بل دعاؤں کے
جھجھکے چند یوجناؤں کے

سوت کے چیلے، موتج کے استاد
تیشے دفتی کے، کانچ کے فرہاد
عالم آٹے کے اور زردے کے امام
اور مٹی کے شاعرانِ کرام

اون کے تیر، روئی کی شمشیر
صدر مٹی کا اور ربڑ کے وزیر
اپنے سارے کھلونے ساتھ لیے
دستِ خالی میں کائنات لیے
دو ستونوں میں باندھ کے رسی
ہم خدا جانے کب سے چلتے ہیں
نہ تو گرتے ہیں نہ سنبھلتے ہیں

۱۹۷۱ء

☆

بنگلہ دیش

میں کوئی ملک نہیں ہوں کہ جلادو گے مجھے
کوئی دیوار نہیں ہوں کہ گرادو گے مجھے
کوئی سرحد بھی نہیں ہوں کہ مٹادو گے مجھے
یہ جو دنیا کا پرانا نقشہ
میز پر تم نے بچھا رکھا ہے
اس میں کاواک لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
تم مجھے اس میں کہاں ڈھونڈتے ہو
میں اک ارمان ہوں دیوانوں کا
سخت جاں خواب ہوں کچلے ہوئے انسانوں کا
لوٹ جب حد سے سوا ہوتی ہے
ظلم جب حد سے گزر جاتا ہے
میں اچانک کسی کونے میں نظر آتا ہوں
کسی سینے سے ابھر آتا ہوں
آج سے پہلے بھی تم نے مجھے دیکھا ہوگا
کبھی مشرق میں کبھی مغرب میں
کبھی شہروں میں کبھی گاؤں میں
کبھی بستی میں کبھی جنگل میں

میری تاریخ ہی تاریخ ہے جغرافیہ کوئی بھی نہیں
اور تاریخ بھی ایسی جو پڑھائی تو نہیں جا سکتی
لوگ چھپ چھپ کے پڑھا کرتے ہیں
کہ میں غالب کبھی مغلوب ہوا
قاتلوں کو کبھی سولی پہ چڑھایا میں نے
اور کبھی آپ ہی مصلوب ہوا
فرق اتنا ہے کہ قاتل مرے مرجاتے ہیں
میں نہ مرتا ہوں نہ مر سکتا ہوں
کتنے نادان ہو تم
تم نے خیرات میں پائے ہیں جو ٹینک
ان کو لے کر مرے سینے پہ چڑھے آتے ہو
رات دن کرتے ہو نا پام بموں کی بارش
دیکھو تھک جاؤ گے
کون سے ہاتھ میں پہناؤ گے زنجیر بتاؤ
کہ مرے ہاتھ تو ہیں سات کروڑ
کون سا سر مری گردن سے جدا کر دو گے
میری گردن پہ ہیں سر سات کروڑ

۱۹۷۱ء

☆

انتشار

کبھی جمود کبھی صرف انتشار سا ہے
جہاں کو اپنی تباہی کا انتظار سا ہے
منو کی مچھلی، نہ کشتیِ نوح اور یہ فضا
کہ قطرے قطرے میں طوفان بے قرار سا ہے
میں کس کو اپنے گریباں کا چاک دکھلاؤں
کہ آج دامنِ یزداں بھی تار تار سا ہے
سجا سنوار کے جس کو ہزار ناز کیے
اسی پہ خالق کونین شرمسار سا ہے
تمام جسم ہے بیدار، فکر خوابیدہ
دماغ پچھلے زمانے کی یادگار سا ہے
سب اپنے پاؤں پہ رکھ رکھ کے پاؤں چلتے ہیں
خود اپنے دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے
جسے پکاریے ملتا ہے اک کھنڈر سے جواب
جسے بھی دیکھیے ماضی کا اشتہار سا ہے
ہوئی تو کیسے بیاباں میں آ کے شام ہوئی
کہ جو مزار یہاں ہے مرا مزار سا ہے
کوئی تو سود چکائے کوئی تو ذمہ لے
اس انقلاب کا جو آج تک ادھار سا ہے

۱۹۷۱ء

غزل

لائی پھر اک لغزشِ مستانہ تیرے شہر میں
پھر بنیں گی مسجدیں میخانہ تیرے شہر میں

آج پھر ٹوٹیں گی تیرے گھر کی نازک کھڑکیاں
آج پھر دیکھا گیا دیوانہ تیرے شہر میں

جرم ہے تیری گلی سے سر جھکا کر لوٹنا
کفر ہے پتھراؤ سے گھبرانا تیرے شہر میں

شاہ نامے لکھے ہیں کھنڈرات کی ہر اینٹ پر
ہر جگہ ہے دفن اک افسانہ تیرے شہر میں

کچھ کنیزیں جو حریمِ ناز میں ہیں باریاب
مانگتی ہیں جان و دل نذرانہ تیرے شہر میں

ننگی سڑکوں پر بھٹک کر دیکھ، جب مرتی ہے رات
رینگتا ہے ہر طرف ویرانہ تیرے شہر میں

☆

دھماکہ

(چارو مجمدار کی یاد میں)

کوئی چوراہا ہو چاہے کوئی ناکہ دوستو!
ہر گھڑی ہر دم کوئی تازہ دھماکہ دوستو!
یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے
دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں
روٹی دے سکتا نہیں
یہ روزی دے سکتا نہیں
یہ کچھ بھی دے سکتا نہیں
اس کی جیبوں میں نہ دنیا ہے نہ دین
اس کی مٹھی میں نہ زر ہے نہ زمین
روح ہے اس کی نگاہوں میں نہ چین
یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں
میں کھڑا تھا کب سے اس خاموش قبرستان میں
قبریں سب خاموش تھیں
اور ان قبروں میں رہنے والے سب خاموش تھے
کھا رہے تھے کیڑے چپکے چپکے بوسیدہ کفن
سبز، نیلے، پیلے سہ رنگے کفن

لاشیں سب ننگی تھیں لاشوں سے سوا ننگے کفن
میں نے ہاتھوں کو ہلایا اس طرح
کونے کونے میں دھماکہ ہوگیا
یہ دھماکہ بس دھماکہ ہے دھماکے کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ بھی تو بس اک دھماکہ تھا دھماکے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جس سے اُچھلیں کہکشائیں
جس سے اُبھری کائنات
گھر سے جب بھی نکلو باہر دوستو
کچھ دھماکے بھر لو اپنی جیب میں
ہر گھڑی ہر دم کوئی تازہ دھماکہ دوستو
کون جانے کوئی ذرہ ٹوٹ جائے

بریچ کینڈی ہاسپٹل، بمبئی ۱۴ فروری ۱۹۷۳ء

☆☆

ایک لمحہ!

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اور ان میں بھی وہی اک لمحہ
جس میں دو بولتی آنکھیں
چائے کی پیالی سے جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں
ڈوب کے دل میں کہیں
آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یوں ہی بیٹھے رہو
ہاتھ میں ہاتھ لیے
غم کی سوغات لیے
گرمیِ جذبات لیے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں
برف پگھلنے ہی لگے

۱۹۷۳ء

زندگی

آج اندھیرا میری نس نس میں اتر جائے گا
آنکھیں بجھ جائیں گی، بجھ جائیں گے احساس و شعور
اور یہ صدیوں سے جلتا سا سلگتا سا وجود
اس سے پہلے کہ سحر ماتھے پہ شبنم چھڑکے
اس سے پہلے کہ مری بیٹی کے وہ پھول سے ہاتھ
گرم رخسار کو ٹھنڈک بخشیں
اس سے پہلے کہ مرے بیٹے کا مضبوط بدن
تن مفلوج میں شکتی بھر دے
اس سے پہلے کہ مری بیوی کے ہونٹ
میرے ہونٹوں کی تپش پی جائیں
راکھ ہو جائے گا جلتے جلتے
اور پھر راکھ بکھر جائے گی

زندگی کہنے کو بے مایہ سہی
غم کا سرمایہ سہی
میں نے اس کے لیے کیا کیا نہ کیا
کبھی آسانی سے اک سانس بھی یمراج کو اپنا نہ دیا

آج سے پہلے بہت پہلے
اسی آنگن میں
دھوپ بھرے دامن میں
میں کھڑا تھا مرے تلووں سے دھواں اٹھتا تھا
ایک بے نام سا بے رنگ سا خوف
کچے احساس پہ چھایا تھا کہ جل جاؤں گا
میں پگھل جاؤں گا
اور پگھل کر مرا کمزور سا "میں"
قطرہ قطرہ مرے ماتھے سے ٹپک جائے گا
رو رہا تھا مگر اشکوں کے بغیر
چیختا تھا مگر آواز نہ تھی
موت لہراتی تھی سو شکلوں میں
میں نے ہر شکل کو گھبرا کے خدا مان لیا
کاٹ کے رکھ دیے صندل کے پراسرار درخت
اور پتھر سے نکالا شعلہ
اور روشن کیا اپنے سے بڑا ایک الاؤ
جانور ذبح کیے اتنے کہ خوں کی لہریں
پاؤں سے اٹھ کے کمر تک آئیں
اور کمر سے مرے سر تک آئیں

سوم رس میں نے پیا
رات دن رقص کیا
ناچتے ناچتے تلوے مرے خوں دینے لگے
میرے اعضا کی تھکن
بن گئی کانپتے ہونٹوں پہ بھجن
ہڈیاں میری چٹخنے لگیں ایندھن کی طرح
منتر ہونٹوں سے ٹپکنے لگے روغن کی طرح
''اگنی ماتا مری اگنی ماتا
سوکھی لکڑی کے یہ بھاری کندے
جو تری بھینٹ کو لے آیا ہوں
ان کو سویکار کر اور ایسے دھدھک
کہ مچلتے شعلے کھینچ لیں جوش میں
سورج کی سنہری زلفیں
آگ میں آگ ملے
جو امر کر دے مجھے
ایسا کوئی راگ ملے''

اگنی ماں سے بھی نہ جینے کی سند جب پائی
زندگی کے نئے امکان نے لی انگڑائی
اور کانوں میں کہیں دور سے آواز آئی

بدھم شرنم گچھامی
دھمم شرنم گچھامی
سنگھم شرنم گچھامی
چار ابرو کا صفایا کر کے
بے سلے وستر سے ڈھانپا یہ بدن
پونچھ کے پتنی کے ماتھے سے دمکتی بندیا
سوتے بچوں کو بنا پیار کیے
چل پڑا ہاتھ میں کشکول لیے
چاہتا تھا کہیں بھکشا ہی میں جیون مل جائے
جو بھی بندہ ہو دل کو وہ دھڑکن مل جائے
مجھ کو بھکشا میں مگر زہر ملا
ہونٹ تھرانے لگے جیسے کرے کوئی گلہ
جھک کے سولی سے اسی وقت کسی نے یہ کہا
تیرے اک گال پہ جس پل کوئی تھپڑ مارے
دوسرا گال بھی آگے کر دے
تیری دنیا میں بہت ہنسا ہے
اس کے سینے میں اہنسا بھر دے
کہ یہ جینے کا طریقہ بھی ہے انداز بھی ہے
تیری آواز بھی ہے، میری آواز بھی ہے
میں اٹھا جس کو اہنسا کا سبق سکھلانے
مجھ کو لٹکا دیا سولی پہ اسی دنیا نے

آرہا تھا میں کئی کوچوں سے ٹھوکر کھا کر
ایک آواز نے روکا مجھ کو
کسی مینار سے نیچے آکر
اللہ اکبر، اللہ اکبر
ہوا دل کو یہ گماں
کہ یہ پرجوش اذاں
موت سے دے گی اماں
پھر تو پہنچا میں جہاں
میں نے دوہرائی بچھا لیے یہ اذاں
گونج اٹھا سارا جہاں
اللہ اکبر، اللہ اکبر
اسی آواز میں اک اور بھی گونجا اعلان
کل من علیھا فان
اک طرف ڈھل گیا خورشیدِ جہاں تاب کا سر
ہوا فالج کا اثر
پھٹ گئی نس کوئی شریانوں میں خوں جم سا گیا
ہو گیا زخمی دماغ
ایسا لگتا تھا کہ بجھ جائے گا جلتا ہے جو صدیوں سے چراغ
آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا

یہ سمندر جو بڑی دیر سے طوفانی تھا
ایسا تڑپا کہ مرے گھر کے اندر آیا
آتے آتے وہ مرے واسطے امرت لایا
اور لہرا کے کہا
شیو نے یہ بھجوایا ہے لو پیو اور
آج شیو علم ہے، امرت ہے عمل
اب وہ آساں ہے جو دشوار تھا کل
رات جو موت کا پیغام لیے آئی تھی
بیوی بچوں نے مرے
اس کو کھڑکی سے پرے پھینک دیا
اور جو وہ زہر کا اک جام لیے آئی تھی
اس نے وہ خود ہی پیا
صبح اتری جو سمندر میں نہانے کے لیے
رات کی لاش ملی پانی میں

۱۹۷۳ء

☆

ایک دعا

(شبانہ کے جنم دن پر)

اب اور کیا ترا بیمار باپ دے گا تجھے
بس اک دعا کہ خدا تجھ کو کامیاب کرے
وہ ٹانک دے ترے آنچل میں چاند اور تارے
تو اپنے واسطے جس کو بھی انتخاب کرے

۱۸ ستمبر ۱۹۷۳ء۔ ماسکو

☆

دور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکے نہ منڈیر
طاق سپنوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصے کا اک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے!

۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء

☆

غزل

میں ڈھونڈھتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا

نئی زمین نیا آسماں بھی مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پہ نشاں نہیں ملتا

وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چولھے
کہ جن میں شعلے تو شعلے دھواں نہیں ملتا

جو اک خدا نہیں ملتا تو اتنا ماتم کیوں
یہاں تو کوئی مرا ہم زباں نہیں ملتا

کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں
تمہارے چہرے کا کچھ بھی یہاں نہیں ملتا

۱۰ ستمبر ۱۹۷۳ء

دور سے بیوی نے چلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکے نہ منڈیر
طاق سپنوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصے کا اک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے!

۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء

☆

غزل

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا

نئی زمین نیا آسماں بھی مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پہ نشاں نہیں ملتا

وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چولھے
کہ جن میں شعلے تو شعلے دھواں نہیں ملتا

جو اک خدا نہیں ملتا تو اتنا ماتم کیوں
یہاں تو کوئی مرا ہم زباں نہیں ملتا

کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں
تمھارے چہرے کا کچھ بھی یہاں نہیں ملتا

ماسکو، ستمبر ۱۹۷۴ء

دور سے بیوی نے جھلا کے کہا
تیل مہنگا بھی ہے ملتا بھی نہیں
کیوں دیے اتنے جلا رکھے ہیں
اپنے گھر میں نہ جھروکے نہ منڈیر
طاق سپنوں کے سجا رکھے ہیں
آیا غصے کا اک ایسا جھونکا
بجھ گئے سارے دیے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے!

۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء

☆

غزل

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا

نئی زمین نیا آسماں بھی مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پہ نشاں نہیں ملتا

وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چولھے
کہ جن میں شعلے تو شعلے دھواں نہیں ملتا

جو اک خدا نہیں ملتا تو اتنا ماتم کیوں
یہاں تو کوئی مرا ہم زباں نہیں ملتا

کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں
تمہارے چہرے کا کچھ بھی یہاں نہیں ملتا

ماسکو، ستمبر ۱۹۷۳ء

کسان

چیر کے سال میں دوبار زمیں کا سینہ
دفن ہو جاتا ہوں
گدگداتے ہیں جو سورج کے سنہرے ناخن
پھر نکل آتا ہوں
اب نکلتا ہوں تو اتنا کہ بٹوئے جو کوئی دامن میں
دامن پھٹ جائے
گھر کے جس کونے میں لے جا کے کوئی رکھ دے مجھے
بھوک وہاں سے ہٹ جائے
پھر مجھے پیستے ہیں، گوندھتے ہیں، سینکتے ہیں
گوندھتے سینکنے میں شکل بدل جاتی ہے
اور ہو جاتی ہے مشکل پہچان
پھر بھی رہتا ہوں کسان
وہی خستہ، بدحال
قرض کے پنجۂ خونیں میں نڈھال
اس درانتی کے طفیل
کچھ ہے ماضی سے غنیمت مرا حال
حال سے ہوگا کہیں استقبال
اٹھتے سورج کو ذرا دیکھو تو
ہو گیا سارا افق لالوں لال

☆

سومناتھ

بت شکن کوئی کہیں سے بھی نہ آنے پائے
ہم نے کچھ بت ابھی سینے میں سجا رکھے ہیں
اپنی یادوں میں بسا رکھے ہیں

دل پہ یہ سوچ کے پتھراؤ کرو دیوانو
کہ جہاں ہم نے صنم اپنے چھپا رکھے ہیں
وہیں غزنیں کے خدا رکھے ہیں

بت جو ٹوٹے تو کسی طرح بنا لیں گے انھیں
ٹکڑے ٹکڑے سہی دامن میں اٹھا لیں گے انھیں
پھر سے اجڑے ہوئے سینے میں سجا لیں گے انھیں

گر خدا ٹوٹے گا ہم تو نہ بنا پائیں گے
اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑے نہ اٹھا پائیں گے
تم اٹھا لو تو اٹھا لو شاید
تم بنا لو تو بنا لو شاید

تم بتاؤ تو خدا جانے بتاؤ کیسا
اپنے جیسا ہی بنایا تو قیامت ہوگی
پیار ہوگا نہ زمانے میں محبت ہوگی
دشمنی ہوگی عداوت ہوگی
ہم سے اس کی نہ عبادت ہوگی

وحشتِ بت شکنی دیکھ کے حیران ہوں میں
بت پرستی مرا شیوا ہے کہ انسان ہوں میں
اک خدا اک بُت تو ہر اک دل میں چھپا ہوتا ہے
اس کے سو ناموں میں اک نام خدا ہوتا ہے

☆

مقتلِ بیروت

اے صبا لوٹ کے کس شہر سے تو آتی ہے
تیری ہر لہر سے بارود کی بُو آتی ہے
خوں کہاں بہتا ہے انسان کا پانی کی طرح
جس سے تو روز یہاں کر کے وضو آتی ہے
دھجیاں تو نے نقابوں کی گنی تو ہوں گی
یونہی لوٹ آتی ہے یا کر کے رفو آتی ہے

ایہاالناس فلسطین صدا دیتا ہے
وہ بھی ایسے کہ کلیجوں کو ہلا دیتا ہے
اس کی آواز پہ لبیک کہا جو تم نے
ہر لبِ زخم سے وہ تم کو دعا دیتا ہے
بے خبر اتنے نہیں تم کہ یہ معلوم نہ ہو
تخت پہ کون یزیدوں کو بٹھا دیتا ہے
شہر مجرم بھی ہے قاتل بھی ہے ملعون بھی ہے
وہ ہے کیا شمر کو خنجر جو تھما دیتا ہے

میری کیوں مانو گے یہ پوچھو تو ہتھیاروں سے
کون اک شہر کو شمشان بنا دیتا ہے
کب اٹھائے گا خدا حشر خدا ہی جانے
آدمی روز کوئی حشر اٹھا دیتا ہے

کسی ہتھیار سے پوچھو وہ بتادے گا تمھیں
کون وہ لوگ ہیں دشمن ہیں جو آزادی کے
نام بتلائیں گی بیروت کی زخمی گلیاں
کون درپے ہوا لبنان کی بربادی کے
بند پانی ہوا بیروت کے جانبازوں پہ
حربے رائج ہیں ابھی تک وہی جلادی کے
ایک اک بوند کو جس وادی میں ترسے تھے حسین
تیل کے چشمے ہیں ناسور اسی وادی کے
بے ضمیری کا ہے یہ عہد خبر ہے کہ نہیں
کس توقع پہ کھلیں لب کسی فریادی کے

اے صبا اب ہو جو بیروت کی گلیوں میں گذر
اور ترے سامنے آجائے کوئی تازہ کھنڈر
اس سے کہہ دینا کہ بھارت کا بھی سینہ ہے فگار
ہل گیا کوہ ہمالہ جو سنی تیری پکار

جتنے کانٹے بھی بچھانا ہو بچھالے کوئی
تیری راہوں سے جدا ہوں گی نہ راہیں اپنی
غم نہ کر ہاتھ اگر تیرے قلم ہو جائیں
جوڑ دیں گے تیرے بازو میں یہ باہیں اپنی

☆

غزل

کیا جانے کس کی پیاس بجھانے کدھر گئیں
اس سر پہ جھوم کے جو گھٹائیں گذر گئیں

دیوانہ پوچھتا ہے یہ لہروں سے بار بار
کچھ بستیاں یہاں تھیں بتاؤ کدھر گئیں

اب جس طرف سے چاہے گذر جائے کارواں
ویرانیاں تو سب مرے دل میں اتر گئیں

پیمانہ ٹوٹنے کا کوئی غم نہیں مجھے
غم ہے تو یہ کہ چاندنی راتیں بکھر گئیں

پایا بھی اُن کو کھو بھی دیا چپ بھی ہو رہے
اک مختصر سی رات میں صدیاں گذر گئیں

☆

غزل

کہیں سے لوٹ کے ہم لڑکھڑائے ہیں کیا کیا
ستارے زیرِ قدم رات آئے ہیں کیا کیا

نشیبِ ہستی سے افسوس ہم ابھر نہ سکے
فرازِ دار سے پیغام آئے ہیں کیا کیا

جب اس نے ہار کے خنجر زمیں پہ پھینک دیا
تمام زخمِ جگر مسکرائے ہیں کیا کیا

چھٹا جہاں سے اس آواز کا گھنا بادل
وہیں سے دھوپ نے تلوے جلائے ہیں کیا کیا

اٹھا کے سر مجھے اتنا تو دیکھ لینے دے
کہ قتل گاہ میں دیوانے آئے ہیں کیا کیا

کہیں اندھیرے سے مانوس ہو نہ جائے ادب
چراغ تیز ہوا نے بجھائے ہیں کیا کیا

☆

غزل

ہاتھ آ کر لگا گیا کوئی
میرا چھپر اٹھا گیا کوئی

لگ گیا اک مشین میں میں بھی
شہر میں لے کے آ گیا کوئی

میں کھڑا تھا کہ پیٹھ پر میری
اشتہار اک لگا گیا کوئی

یہ صدی دھوپ کو ترستی ہے
جیسے سورج کو کھا گیا کوئی

ایسی مہنگائی ہے کہ چہرہ بھی
بیچ کے اپنا کھا گیا کوئی

اب وہ ارمان ہیں نہ وہ سپنے
سب کبوتر اڑا گیا کوئی

وہ گئے جب سے ایسا لگتا ہے
چھوٹا موٹا خدا گیا کوئی

میرا بچپن بھی ساتھ لے آیا
گاؤں سے جب بھی آ گیا کوئی

☆

نظم

میرا ماضی میرے کاندھے پر

اب تمدن کی ہو یہ جیت کہ ہار
میرا ماضی ہے ابھی تک مرے کاندھے پہ سوار
آج بھی دوڑ کے گلّے میں جو مل جاتا ہوں
جاگ اٹھتا ہے مرے سینے میں جنگل کوئی
سینگ ماتھے پہ اُبھر آتے ہیں
پڑتا رہتا ہے مرے ماضی کا سایہ مجھ پر
دورِ خونخواری سے گذرا ہوں چھپاؤں کیونکر
دانت سب خون میں ڈوبے نظر آتے ہیں
جن سے میرا نہ کوئی بیر نہ پیار
ان پہ کرتا ہوں میں وار
ان کا کرتا ہوں شکار
اور بھرتا ہوں جہنم اپنا
پیٹ ہی پیٹ مرا جسم ہے دل ہے نہ دماغ
کتنے اوتار بڑھے لے کے ہتھیلی پہ چراغ
دیکھتے رہ گئے دھو پائے نہ ماضی کے یہ داغ

مل لیا ماتھے پہ تہذیب کا غازہ لیکن
بربریت کا ہے جو داغ وہ چھوٹا ہی نہیں
گاؤں آباد کیے شہر بسائے ہم نے
رشتہ جنگل سے جو اپنا ہے وہ ٹوٹا ہی نہیں
جب کسی موڑ پہ پر کھول کر اُڑتا ہے غبار
اور نظر آتا ہے اس میں کوئی معصوم شکار
جانے ہو جاتا ہے کیوں سر پہ جنوں ایک سوار
کسی جھاڑی سے الجھ کے جو کبھی ٹوٹی تھی
وہی دُم پھر سے نکل آتی ہے
وہی لہراتی ہے
اپنی ٹانگوں میں دبا کے جسے بھرتا ہوں زقند
اتنا گر جاتا ہوں صدیوں میں ہوا جتنا بلند

☆

سانپ

یہ سانپ آج جو پھن اٹھائے
مرے راستے میں کھڑا ہے
پڑا تھا قدم چاند پر میرا جس دن
اسی دن اسے مار ڈالا تھا میں نے
اکھاڑے تھے سب دانت کچلا تھا سر بھی
مروڑی تھی دم توڑ دی تھی کمر بھی

مگر چاند سے جھک کے دیکھا جو میں نے
تو دُم اس کی ہلنے لگی تھی
یہ کچھ رینگنے بھی لگا تھا

یہ کچھ رینگتا کچھ گھسٹتا ہوا
پرانے شوالے کی جانب چلا
جہاں دودھ اس کو پلایا گیا
پڑھے پنڈتوں نے کئی منتر ایسے
یہ کم بخت پھر سے جلایا گیا

شوالے سے نکلا وہ پھنکارتا
رگِ ارض پر ڈنک سا مارتا

بڑھا میں کہ اک بار پھر سر کچل دوں
اسے بھاری قدموں سے اپنے مسل دوں
قریب ایک ویران مسجد تھی، مسجد میں
یہ جا چھپا
جہاں اس کو پٹرول سے غسل دے کر
حسین ایک تعویذ گردن میں ڈالا گیا
ہوا جتنا صدیوں میں انساں بلند
یہ کچھ اس سے اونچا اچھالا گیا

اچھل کے یہ گرجا کی دہلیز پر جا گرا
جہاں اس کو سونے کی کینچل پہنائی گئی
صلیب ایک چاندی کی سینے پہ اس کے سجائی گئی
دیا جس نے دنیا کو پیغامِ امن
اسی کے حیات آفریں نام پر
اسے جنگ بازی سکھائی گئی
ہوس کا گلوبند گردن میں ڈالا
اور اس رنگ سے میداں میں اس کو نکالا

پڑا اس کا دھرتی پہ سایہ
تو دھرتی کی رفتار رکنے لگی

اندھیرا اندھیرا زمیں سے
فلک تک اندھیرا
جبیں چاند تاروں کی جھکنے لگی

ہوئی جب سے سائنس زر کی مطیع
جو تھا علم کا اعتبار اٹھ گیا
اور اس سانپ کو زندگی مل گئی
اسے ہم نے ضحاک کے بھاری کاندھے پہ دیکھا تھا اک دن
یہ ہندو نہیں ہے مسلماں نہیں
یہ دونوں کا مغز اور خوں چاٹتا ہے

بنے جب یہ ہندو مسلمان انساں
اسی دن یہ کم بخت مر جائے گا

☆

جاگیے

ڈھلتے ڈھلتے یہ رات یہ کہہ گئی
جاگیے آپ کے دوست نے بم بنا بھی لیا
اور تب آپ اسے ایک دن آزما بھی لیا

نیلے پانی کی سب سیم تن مچھلیاں جل گئیں
ننھی پریاں تھرکتی حسیں تتلیاں جل گئیں
جل گیا نبض کھیتی میں جوشِ نمو
جل گئی باغ کی حسرت رنگ و بو
اور بہاروں نے خیمہ چمن سے اٹھا بھی لیا
جاگئے آپ کے دوست نے بم بنا بھی لیا

(۲)

دفعتاً ایک ایسا بھیانک دھماکہ ہوا
جو فرشتے زمیں پر اُتر آئے تھے اڑ گئے
یہ سلگتی پگھلتی زمیں چھوڑ کے
آسمانوں سے اک بار پھر جڑ گئے

عصرِ نو کے لیے جو صحیفہ نیا لائے تھے
اس کو اپنے پروں میں چھپا بھی لیا
اب سلامت کسی کی ہے دنیا نہ دیں
روئی کی طرح دھنکی پڑی ہے خدا کی زمیں
جسمِ انساں کے ٹکڑے درختوں میں اٹکے ہوئے
چاند اندھیرے کی سولی پہ لٹکے ہوئے
ٹوٹتے تاروں کو دھرتی نے کھا بھی لیا
جاگئے آپ کے دوست نے بم بنا بھی لیا

☆

شانتی بن کے قریب

وہ وطن کی آبرو کل شانتی بن کے قریب
یوں زمیں پر سو رہی تھی جیسے مفلس کا نصیب

آنکھیں وا تھیں دیدے گردش میں تھے ساکت تھی زباں
اور نازک جسم میں پیوست لاکھوں سوئیاں

غور سے دیکھا تو دل کو اور حیرانی ہوئی
سوئیاں ساری تھیں میری جانی پہچانی ہوئی

سوئیاں ہندو بھی تھیں، مسلم بھی تھیں اور سکھ بھی تھیں
اور تھا اُن کے تصرّف میں وہ جسمِ نازنیں

کچھ تھیں اونچی ذات کی جو اس لئے تھیں سرخرو
بے تکلف پیتی تھیں وہ نیچی جاتی کا لہو

ایک اک سوئی کے لب پر اس کے صوبے کا تھا نام
چاہتی تھیں سب الگ بھارت سے اپنی صبح و شام

ڈرتے ڈرتے میں نے آخر کر لیا اس سے سوال
کیا ہوا، کیسے ہوا کس نے کیا یہ تیرا حال

بولی وہ اپنوں ہی کے ہاتھوں ہوئی یہ میری گت
میں نے پوچھا نام تو اس نے کہا جمہوریت

سن کے اس کا نام ان آنکھوں میں آنسو آ گئے
بولی وہ تم تو ذرا سی بات سے گھبرا گئے

اس کا رونا کیا ہے پہلے کیا تھی اور کیا ہوں ابھی
سوئیاں چن لو تو دیکھو گے کہ زندہ ہوں ابھی

☆

غزل

وہ بھی سراہنے لگے اربابِ فن کے بعد
دادِ سخن ملی مجھے ترکِ سخن کے بعد

دیوانہ وار چاند سے آگے نکل گئے
ٹھہرا نہ دل کہیں بھی تری انجمن کے بعد

ہونٹوں کو سی کے دیکھیے پچھتائے گا آپ
ہنگامے جاگ اٹھتے ہیں اکثر گھٹن کے بعد

غربت کی ٹھنڈی چھاؤں میں یاد آئی اس کی دھوپ
قدرِ وطن ہوئی ہمیں ترکِ وطن کے بعد

انساں کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں
دو گز زمیں بھی چاہیے دو گز کفن کے بعد

اعلانِ حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد

☆

غزل

شور یونہی نہ پرندوں نے مچایا ہوگا
کوئی جنگل کی طرف شہر سے آیا ہوگا

پیڑ کے کاٹنے والوں کو یہ معلوم تو تھا
جسم جل جائیں گے جب سر پہ نہ سایہ ہوگا

بانی جشن بہاراں نے یہ سوچا بھی نہیں
کس نے کانٹوں کو لہو اپنا پلایا ہوگا

بجلی کے تار پہ بیٹھا ہوا ہنستا پنچھی
سوچتا ہے کہ وہ جنگل تو پرایا ہوگا

اپنے جنگل سے جو گھبرا کے اڑے تھے پیاسے
ہر سراب ان کو سمندر نظر آیا ہوگا

☆

غزل

کی ہے کوئی حسین خطا ہر خطا کے ساتھ
تھوڑا سا پیار بھی مجھے دے دو سزا کے ساتھ

گر ڈوبنا ہی اپنا مقدر ہے تو سنو
ڈوبیں گے ہم ضرور مگر ناخدا کے ساتھ

منزل سے وہ بھی دور تھا اور ہم بھی دور تھے
ہم نے بھی دھول اڑائی بہت رہنما کے ساتھ

رقص صبا کے جشن میں ہم تم بھی ناچتے
اے کاش تم بھی آ گئے ہوتے صبا کے ساتھ

اکیسویں صدی کی طرف ہم چلے تو ہیں
فتنے بھی جاگ اٹھے ہیں آواز پا کے ساتھ

ایسا لگا غریبی کی ریکھا سے ہوں بلند
پوچھا کسی نے حال کچھ ایسی ادا کے ساتھ

☆

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

انتساب

میں اپنی یہ نظم برصغیر ہند و پاک کے معتبر دانشور

سبطِ حسن

کے نام معنون کرتا ہوں۔

کیفی اعظمی

بیانِ صفائی

ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس) لکھ کے میں اپنے کو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا پاتا ہوں اور اپنے ضمیر کو انصاف کی کرسی پر بٹھا کے اپنی صفائی پیش کر رہا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ آج سے کوئی ۳۰، ۳۵ برس ادھر جب میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر اقبالؔ کی مشہور نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ پڑھی تھی تو اس سے متاثر ہوا تھا اور مرعوب بھی لیکن بعد میں جب تاریخ کی ٹھیک وہی رفتار نہیں رہی ابلیس نے جس کی پیشینگوئی کی تھی تو بار بار یہ خواہش جاگی کہ میں ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس بلاؤں اور اس کی روداد قلمبند کروں لیکن ایک تو اقبال کے لہجے اور آہنگ سے اتنا مرعوب تھا کہ قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ دوسری یہ جھجک بھی تھی کہ میرا شمار لکھنؤ کے ان شاعروں میں نہ ہونے لگے جنھوں نے شکوہ کے جواب میں لمبی لمبی نظمیں لکھیں۔ جعفری صاحب کا شکرگذار ہوں کہ انھوں نے اپنے پیش لفظ میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ یہ نظم اقبالؔ کا جواب نہیں ہے۔ یہی سچ بھی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں اور میری طرح ساری دنیا دیکھ رہی ہے کہ سوشلزم اقبال کے ابلیس نے جس کو قابل اعتنا بھی نہ سمجھا تھا اور جس کا توڑ اس نے فسطائیت میں دیکھا تھا آج

وہ نظریۂ حیات فاتحانہ پورے عالم انسانیت کو اپنی وسیع بانہوں میں سمیٹے لے رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جب فسطائیت اور نازی ازم نے سوشلزم کے ہاتھوں فیصلہ کن شکست کھائی تو میں نے اور ساحر مرحوم نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ ہم دونوں مل کے ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس لکھیں لیکن وہ منصوبہ بہت سے سرکاری منصوبوں کی طرح کاغذ ہی پر رہا لیکن اس زمانے میں بیروت میں فلسطینی مجاہدوں کا جس طرح قتل عام ہوا اس نے میرے ضمیر کو اس طرح جھنجھوڑا کہ میں نے یہ نظم لکھ ہی ڈالی۔ اپنے فلسفۂ حیات پر مجھے جتنا اعتماد ہے اگر اپنے فن پر بھی اتنا اعتماد ہوتا تو یہ نظم اب سے بہت پہلے لکھ چکا ہوتا اور صفائی پیش کرنے کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔

کیفی اعظمی

(۱۹۸۳ء)

پیش لفظ

اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا شمار اقبال کی بہترین تخلیقات میں نہیں کیا جا سکتا جیسے شمع و شاعر، خضر راہ، طلوعِ اسلام، ساقی نامہ، مسجد قرطبہ، لینن خدا کے حضور میں اور فرمانِ خدا فرشتوں کے نام۔ اسی طرح کیفی کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس" کا بھی شمار کیفی کی شاہکار نظموں کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ دونوں نظمیں اپنی عصری معنویت اور تاریخی بلاغت کے اعتبار سے بیحد اہم ہیں۔ اقبال کی انقلابی فکر کی تکفیر کرنے والے بعض نقادوں نے ابلیس کی مجلس شوریٰ کو خاص طور سے اہمیت دی ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہ نظم کالجوں اور مدرسوں کے حلقے میں محدود رہی اور اقبال کے عام قاری کی توجہ کو بھی حاصل نہ کر سکی۔

اقبال نے انقلاب روس کے بعد اشتراکیت میں بے انتہا کشش محسوس کی اور اردو شاعری کو ایک نئی اور خوبصورت انقلابی جہت سے آشنا کیا۔ یہ کشش وقتی نہیں تھی۔ ۱۹۱۷ء کے بعد سے ۱۹۳۸ء تک اس کا اظہار ان کی شاعری میں مسلسل ہوتا رہا۔ لیکن بعض اوقات ایسی کیفیات کا اظہار بھی ہوا جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال اشتراکیت کے بعض پہلو قبول کرنے سے جھجک رہے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کو شیکسپیئر نے ہیملٹ کے کردار میں مجسم کر دیا ہے یعنی صحیح اقدام کی بے پناہ خواہش بھی اور پھر اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے گریز بھی۔ اس کیفیت کو شیکسپیئر

نے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ **To be or not to be that is the question**

ایک دوسرے انداز سے اس نفسیاتی کیفیت کو غالب نے یوں بیان کیا ہے:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اور ایک مصرعے میں جو بات اقبال نے نطشے اور کارل مارکس کے لئے کہی ہے اس کا اطلاق خود اقبال پر بھی ہوتا ہے

قلب او مومن دماغش کافر است

یہاں کافر منکر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

شہزادہ ہیملٹ کی اس نفسیاتی کیفیت میں سیاسی سطح پر پنڈت جواہر لال نہرو اور شاعرانہ اور مفکرانہ سطح پر اقبال شریک ہیں یہ تذبذب ہی ابلیس کی مجلس شوریٰ کی تخلیق کا باعث ہے ورنہ جس شاعر نے صاف صاف الفاظ میں یہ لکھا ہو۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب اے انقلاب

وہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اقبال کی زندگی میں ان کی آخری کتاب "ضربِ کلیم" شائع ہوئی (۱۹۳۶ء) اس کے دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کتاب میں دو صفحات پر آمنے سامنے تین نظمیں ہیں جو بالِ جبریل کی "لینن خدا کے حضور میں فرشتوں کا گیت اور فرمانِ خدا"

کی طرح ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان ''اشتراکیت'' ہے اور اس میں یہ مصرعہ ہے کہ ع

بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اور اس میں شاعر نے اسلام کے ان اسرار کو بیان کیا ہے جنھیں انسان کی ہوس نے صدیوں سے چھپا کر رکھا تھا۔ اور وہ ہیں آیت قرآنی قل العفو کے مفاہیم اور وہ بہت بلیغ ہیں یعنی جو کچھ انسان کے ذاتی اخراجات سے فاضل ہو وہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں بعض علما نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس پانی ہے اور دوسرے کے پاس نہیں ہے تو پہلا شخص سیراب ہونے کے بعد باقی پانی پیاسے آدمی کو دیدے اور اگر وہ انکار کرے تو پیاسے آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ زبردستی پانی چھین لے۔ اس طرح اقبال نے روس یا اشتراکیت کی معاشی جمہوریت کو اسلام کی تعلیم کے مطابق قرار دیا ہے۔ دوسری نظم ''کارل مارکس کی آواز'' ہے جس میں مارکس یورپ کے معاشی نظام کو عقل عیار کی نمائش قرار دیتا ہے۔ اور تیسری نظم قطعہ کی شکل میں ہے اور اس کا عنوان انقلاب ہے اور آخری دو مصرعے ہیں:

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہان پیر کی موت

یہ وہی بات ہے جو فرمان خدا کے عنوان سے بال جبریل کی نظم میں کہی گئی ہے:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس کے بعد جب ہم ابلیس کی مجلس شوریٰ پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اقبال نے خود اپنے پیام کی تردید کی ہے۔ اقبال کی پوری شاعری میں ابلیس کا کردار ایک انقلابی کردار ہے۔ وہ فطرت کے جدلیاتی نظام میں اثبات کے مقابلے پر نفی کی طاقت ہے اور ان کے باہمی ردعمل سے ارتقا اور انقلاب کی منزلیں طے ہوئی ہیں۔ چنانچہ ابلیس اقبال کے فلسفے میں خواجہ اہل فراق ہے (ہجر میں لذت طلب وصل میں مرگ آرزو) وہ ''خون رگ کائنات'' ہے۔ وہ اپنے آپ کو ''داور بے محشرم ماہر بے دوزخم'' کہتا ہے اور جبریل کے سامنے فخریہ انداز سے کہتا ہے کہ

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

یہ مولوی کے ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' والا ابلیس نہیں ہے بلکہ وہ ابلیس ہے جو ''پیام مشرق'' میں اس شان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم کو تخلیق خدا نے کیا ہے۔ لیکن وہ جوان ابلیس کی گود میں ہوا ہے اور اس طرح ''ابلۂ جنت دانائے راز'' بنا ہے اور نیک و بد میں تمیز کر کے اپنی انسانی صفات کو خدائی صفات میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یہ ایک فلسفیانہ توجیہہ ہے۔ لیکن ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے دوسرے اجلاس کا ابلیس ایک رجعت پرست کردار ہے جو سامراج شاہی، شہنشاہیت

اور فاشزم کا خالق ہے اور اپنی آنکھوں سے اپنی شکست کا نظارہ کر رہا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ شکست اشتراکیت کے ہاتھوں ہوگی یا اسلام کے ہاتھوں یا دونوں کے انقلابی اشتراک سے۔ اقبال کی نظم کے بعد کیفی کی نظم اس صورت حال کی نشان دہی کرتی ہے۔

اقبال کی نظم میں چار نظام ہیں۔ ایک شہنشاہیت دوسرے فاشزم، تیسرے اشتراکیت، چوتھے اسلام۔ ان میں سے پہلے دو نظام ابلیس کی تخلیق ہیں اور انقلاب کی زد پر ہیں اور متزلزل نظر آ رہے ہیں۔ اشتراکی نظام اور اسلام کا ابلیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں میں یہ اہم مماثلت ہے کہ یہ دونوں ابلیسی نظاموں کے خاتمے کا باعث ہیں۔ یہاں اگر اقبال کی زبان اور لہجے کا تجزیہ کیا جائے تو یہ دلچسپ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابلیس کے تیسرے اور چوتھے مشیر کی تنقید سے مارکس اور اشتراکیت کی عظمت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ مثلاً تیسرا مشیر یہ کہتا ہے کہ مغرب کے جمہوری نظام کے اندر روح سلطانی کارفرما ہے لیکن وہ اس کو زندہ نہیں رکھ سکے گی کیونکہ ایک یہودی (مارکس) شرارت پر آمادہ ہے:

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

اس کے جواب میں ابلیس اپنی نئی تخلیق فاشزم کا ذکر کرتا ہے جو روما الکبریٰ کے ایوانوں سے ابھر رہی ہے اور اشتراکیت کو ختم کر دے گی۔ اس پر پانچواں مشیر پھر مارکس اور اشتراکیت کی ناقابل شکست طاقت کا ذکر کرتا ہے:

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار

وہ یہودی فتنہ گر وہ روح مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اسکے جنوں سے تار تار

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار

چھا گئی آشفتہ ہوکر وسعت افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشت غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ان اشعار کے بارے میں اسلوب احمد انصاری، جو اشتراکیت کے شیدائی نہیں ہیں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ "ان سب الفاظ اور تراکیب کا مجموعی تاثر انقلابی تحریک کے دور رس، تہلکہ خیز اور لامحدود امکانات اور نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی بھونچال ہے جس نے زمین اور آسمان کو ہلا کر رکھ دیا ہے یا تو انائی کا لاوا ہے جو اندر سے ایک دم پھوٹ پڑا ہے۔"

(اقبال کی تیرہ نظمیں صفحہ ۱۹۵)

اور یہ واقعہ ہے کہ اس نظم میں اقبال کا سارا زور بیان اور حسن بیان اس مقام پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ابلیس جس کمزور دلیل کا سہارا لیتا ہے اس میں بڑے سے بڑے شاعر کے پاس بھی زور بیان اور حسن بیان کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ ابلیس کی دلیل صرف اتنی ہے:

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد

لیکن اس دعوے اور دلیل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انہیں پریشان روزگار اور "آشفتہ مغز آشفتہ ہو" "لوگوں نے سرمایہ داری اور ملوکیت کی بساط کو الٹ کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے ابلیس کی مجلس شوریٰ منعقد کرنے کا جواب پیدا ہوتا ہے۔ اگر اشتراکی کوچہ گرد اس بساط کو نہ الٹتے تو اس نظم کی تخلیق ہی نہ ہوتی۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

ایک ایسا بیان ہے جس کی تردید وہ خود آگے آنے والے اشعار میں کر دیتا ہے:

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ جس بندۂ مومن کا دین سرمایہ داری ہے وہ سرمایہ داری اور ملوکیت کے لئے اشتراکیت سے زیادہ بڑا خطرہ کیسے بن سکتا ہے۔ شاعر نے ہے وہی سرمایہ داری کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سرمایہ

داری کی ملوکیت کو اشتراکیت ختم کر چکی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ شاعر کا انقلابی ضمیر بول رہا ہے یا اس کا بیدار سیاسی شعور۔ اس کے بعد ابلیس اس امت کی وہ ساری کمزوریاں بیان کرتا ہے جو اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کے باعث ہیں اس کے پیران حرم کی آستیں میں ید بیضا نہیں ہے اور پیران حرم کی ترکیب اقبال کے اس شعر کی یاد دلا دیتی ہے:

یہی پیر حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہراؓ

اب ابلیس کی ساری آس اور امید اس امت کی بیداری پر ہے اور اس بیدار امت کی جن خوبیوں کو اقبال نے بیان کیا ہے وہ اقبال کے اسلام کی تشکیل نو کے خلاف ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ گاندھی کی تعلیمات ہیں جو غیر انقلابی رہی ہیں جن میں سرمایہ دار دولت کا متولی بن جاتا ہے اور کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار" کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے جب یہ شعر آتا ہے کہ:

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

تو بے ساختہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم حکمرانوں اور مسلم سلطنتوں کی چودہ سو برس کی تاریخ میں اس پر کبھی عمل نہیں کیا گیا اور زمین بادشاہوں اور جاگیرداروں کی ملکیت رہی اور زمین جوتنے والا کسان جانوروں سے بدتر زندگی گزارتا رہا۔ اور آج جب اشتراکی کوچہ گردوں نے زمین جاگیرداروں سے لے کر کسانوں کو واپس کر دی اور الارض ﷲ صحیح معنوں پر عمل کیا تو ابلیس یہ کہتا ہے کہ عمل کرنے والوں سے زیادہ خطرہ سرمایہ داری نظام اور ملوکیت کو ان بے عملوں سے ہے جو حامل قرآن نہیں ہیں لیکن

بیدار ہو سکتے ہیں۔ یہ اقبال کی نظم کا سب سے کمزور حصہ ہے۔

لیکن اقبال کی نظم ابلیس کی مجلسِ شوریٰ اس اعتبار سے بہت زیادہ اہم نظم ہے کہ اقبال کی تاریخی بصیرت نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایشیا میں سرمایہ داری ملوکیت اور اشتراکیت کی جنگ میں اسلام کا شریک ہونا ضروری ہے اور آخری بات یہ ہوگی کہ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے لیکن خود اقبال کی تعلیمات اور افکار میں یہ چیز موجود ہے کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کا جواز اسلام کی تعلیمات میں موجود ہے۔

دراصل کیفی کی نظم اقبال کی نظم کا جواب نہیں ہے بلکہ ان امکانات کا اظہار ہے جو اس تاریخی دور کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔ آج عالم اسلام اور اشتراکیت کے درمیان ایک نئی مفاہمت کی ضرورت ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ سرمایہ داری ملوکیت کا خاتمہ صرف اشتراکیت کرے گی اور اسلام کی جمہوری اور انسانی روایات اس کا ساتھ دیں گی۔

اقبال کی یہ بشارت پوری ہوگی:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

سردار جعفری
(۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۳ء)

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

۱۹۳۶ء

اقبال

ابلیس

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں!
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں!
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

بیدار ہو سکتے ہیں۔ یہ اقبال کی نظم کا سب سے کمزور حصہ ہے۔

لیکن اقبال کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ اس اعتبار سے بہت زیادہ اہم نظم ہے کہ اقبال کی تاریخی بصیرت نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایشیا میں سرمایہ داری ملوکیت اور اشتراکیت کی جنگ میں اسلام کا شریک ہونا ضروری ہے اور آخری بات یہ ہوگی کہ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے لیکن خود اقبال کی تعلیمات اور افکار میں یہ چیز موجود ہے کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کا جواز اسلام کی تعلیمات میں موجود ہے۔

دراصل کیفی کی نظم اقبال کی نظم کا جواب نہیں ہے بلکہ ان امکانات کا اظہار ہے جو اس تاریخی دور کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔ آج عالم اسلام اور اشتراکیت کے درمیان ایک نئی مفاہمت کی ضرورت ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ سرمایہ داری ملوکیت کا خاتمہ صرف اشتراکیت کرے گی اور اسلام کی جمہوری اور انسانی روایات اس کا ساتھ دیں گی۔

اقبال کی یہ بشارت پوری ہوگی:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

سردار جعفری

(۲۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

۱۹۳۶ء

اقبال

ابلیس

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں!
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں!
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں!
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

تیسرا مشیر

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
وہ کلیم بے تجلی! وہ مسیح بے صلیب!
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب!
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب!

چوتھا مشیر

توڑ اس کا رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب
کون بحرِ روم کی موجوں سے ہے لپٹا ہوا
'گاہ بالد چوں صنوبر گاہ نالد چوں رباب'!

تیسرا مشیر

میں تو اسکی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب!

پانچواں مشیر

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار
تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز
ابلہِ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں
سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف
تیری غیرت سے ابد تک سرنگون و شرمسار
گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام
اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار

وہ یہودی فتنہ گر وہ روح مزدک کا بُروز
ہر قبا ہونے کو ہے اسکے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار
چھا گئی آشفتہ ہوکر وسعت افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشت غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس

ہے مرے دست تصرف میں جہان رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمان تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق
میں نے جب گرما دیا اقوام یورپ کا لہو
کیا امامان سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو!

کارگاہ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

۲

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھکر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

۳

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

☆

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

دوسرا اجلاس

کیفی اعظمی

۱۹۸۳ء

ابلیس

الامان و الحذر گیتی کا یہ رقصِ جنوں
ڈھل چلا ہے ایک سانچے میں جہانِ کاف و نوں
مشرق و مغرب میں پہلی سی نہیں بے گانگی
سرحدوں نے مل لیا رخسار پہ سمتوں کا خوں
مٹ چلے تیزی سے رنگ و نسل کے سب تفرقے
جن کے ہاتھوں آج تک انساں رہا زار و زبوں
مسجد و دیر و کلیسا آج اک مرکز پہ ہیں
گھومتی ہے آج اک محور پہ یہ دنیائے دوں
پرچمِ توحیدِ انساں تا ثریا ہے بلند
جس کو جھک کر چومتا ہے آسمانِ نیلگوں
ہو گیا کس طرح انساں ہم سے اتنا منحرف
اس کے کانوں میں نہ جانے کس نے پھونکا یہ فسوں

پہلا مشیر

میں کہ اس مجلس تھا تیری صدائے بازگشت
آج حرف حق کہوں مل جائے گا گر اذن کلام
یہ جو شہبازوں کی گردن پر ممولے ہیں سوار
یہ جو آقا کا گریباں چاک کرتے ہیں غلام
ہو رہی ہیں یہ جو پیہم طے خلا کی منزلیں
قافلہ انسانیت کا ہے جو اتنا تیز گام
جس کو بہکا کر نکلوایا تھا جنت سے کبھی
رہ گئی ہے اس سے جنت اب تو بس دو ایک گام
جس کی رفعت کو ازل کی صبح تو پہونچا نہ تھا
گاڑنے والا ہے وہ افلاک پر اپنے خیام
تیری نخوت جس کو خاطر میں کبھی لائی نہیں
ناسمجھ یہ سب اسی مرد یہودی کا ہے کام
تیرے کہنے سے جسے محکم سمجھ بیٹھا تھا میں
نکلا تار عنکبوت آخر وہ ابلیسی نظام

دوسرا مشیر

ہو رہی ہے نوع انساں ایک یہ تسلیم ہے
یہ بھی تو دیکھ آدمی طبقات میں تقسیم ہے
لٹنے والے ہیں ہزاروں لوٹنے والے ہیں چند
زندگی کی کل جو تھی ابتک وہی تنظیم ہے
یہ زبور وحدت انساں جو لے آیا ہے تو
اس میں جتنا سچ ہے وہ بھی لائق ترمیم ہے
آجر و مزدور کا جب تک رہے گا یہ تضاد
دعویٰ وحدت ترا ناقابل تفہیم ہے

تیسرا مشیر

کم سوادی اک مرض ہے کچھ نہیں جس کا علاج
کیسے تو بدلا ہوا دیکھے گا دنیا کا مزاج
جو بھی مزدک نے دیکھا تھا وہ بیشک خواب تھا
اک حقیقت بن گیا لینن نے وہ دیکھا جو آج
جس میں طبقوں کی پرانی کشمکش باقی نہیں
ہے اسی روئے زمیں پر ایک ایسا بھی سماج
کر کے چشم تنگ وا اس دنیا کا نظارہ کر
جس جگہ پہلے پہل محنت نے رکھا سر پہ تاج

بن گئے ہونٹوں تک آتے آتے شورِ انقلاب
عصرِ نو کو یاد تھے جتنے بھی حرفِ احتجاج

چوتھا مشیر

رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں سے اٹھا ہے جو شور
دب کے رہ جائے گا اس میں سارا شورِ انقلاب
اشتراکی روس اک کنجشک ہے جس کو کبھی
داب کے پنجے میں اڑ جائے گا یہ فاشی عقاب

تیسرا مشیر

گو مجھے حرفِ مکرر کی اجازت تو نہیں
آخری مجلس ہے تیری آخری میرا جواب
روس اک کوہِ حقیقت ہے بساطِ ارض پر
ریزہ ریزہ ہو گیا ٹکرا کے جس سے تیرا خواب
اپنے پر چلتا ہے اپنی خونچکاں منقار میں
تلملا کر روس پر جھپٹا تھا جو فاشی عقاب

ابلیس

طنز ہے پھیکا ترا بے مغز تیری گفتگو
اشتراکیت کے بحرانوں سے ناواقف ہے تو
روس سے دست و گریباں ماؤ وادی چین ہے
روانگا سے بدگماں پولینڈ کی ہے آبجو
ہو رہا ہے آئے دن تازہ تضادوں کا ظہور
ہے زوالِ آمدہ لینن کا جہانِ آرزو
اختلافوں نے کیا خامی کو اس کی بے نقاب
جس کے استحکام کا بجتا تھا ڈنکا چار سو

پانچواں مشیر

۲

ہو گی تیری طبعِ نازک پر گراں یہ گفتگو
وقت کی رفتار سے ہے کس قدر بیگانہ تو
یہ تضادوں کا تصادم ہے ترقی کی دلیل
اپنی نافہمی سے سمجھا ہے جسے بحران تو
پہلے تنہا روس تھا اب اسکے ساتھی ہیں کئی
اور ہر ساتھی کو اپنی راہ کی ہے جستجو

اختلافوں کا ہوا خود اعتمادی سے ظہور
ہے خرد کی پختگی خامی جسے سمجھا ہے تو
کرۂ گیتی ہتھیلی پہ اٹھائے شان سے
کس بلندی پر ہے یقین کا جہان آرزو
ہر قدم پر تجھ سے ہوتا جا رہا ہے اور دور
چل پڑا کس راستے پر یہ جہان رنگ و بو
کر رہے ہیں عصر حاضر کی وہی مشاطگی
جن کو تو کہتا تھا کل آشفتہ مغز آشفتہ ہو
چھین لی ساقی سے پیاسوں نے کلید میکدہ
توڑ ڈالے ناروا تقسیم کے جام سبو
جن کے چشموں میں خاکستر ہے ان کی تہ نشیں
جن کی خاکستر میں چمکا تھا شرار آرزو
آج صہبائے تعیش میں ہیں وہ ڈوبے ہوئے
کرتے تھے اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
دیکھ اپنی شکل یا جھلا کے اسکو توڑ ڈال
رکھ دیا آئینہ میں نے آج تیرے روبرو
کل جو نازی تھے وہ کمبخت آج اسرائیل ہیں
جنکے آگے سر بہ سجدہ وارثان نیل ہیں

قطعہ

دیکھ بھی لے کتنی ظالم گردش ایام ہے
جس کو تو شاہیں سمجھتا تھا وہ زیر دام ہے
کیمپ ڈیوڈ سے زلیخا لوٹی یہ کہتی ہوئی
ماہ کنعاں کا نہیں سادات کا نیلام ہے
سارے ہتھیاروں کے تاجر آئے ہیں ڈالر بدست
ہم سے دل والوں کا اس بازار میں کیا کام ہے
اپنے عالی شان حجروں سے نکل سکتے نہیں
جو سراپا انتظار صور اسرافیل ہیں
دیکھنے والے فلسطینی جگرداروں کا قتل
اپنی اپنی خلوتوں میں محو قال و قیل ہیں
کرتے ہیں تسبیح کے دانوں پہ جو ڈالر شمار
پیٹ ہیں کشکول انکے داڑھیاں زنبیل ہیں

کیوں فروغ اشتراکیت سے تو ہے دردمند
اب ہیں مسلم بھی اسی پرچم کے نیچے سر بلند
اس طرف ہے سرنگونی سرفرازی اُس طرف
مصر کو کیا دیکھتا ہے دیکھ سوئے تاشقند

ہاتھ بندھوا کر پڑھائی جن سے مُلّا نے نماز
چھینکتے ہیں آج وہ چاند اور تاروں پر کمند
ہیں وہی شیرِ خدا کے شیر جو آزاد ہوں
ورنہ محکومی میں بن جاتے ہیں وہ بھی گوسفند
تابہ منبر آگیا گلیوں سے خوں بہتا ہوا
ہوگی کب بیروت میں تیغِ یدالّلٰہی بلند
اس کو چھونے کی دوبارہ کرکے ہمت دیکھ لے
اشتراکیت کا پرچم آج ہے کتنا بلند

ابلیس

جس بلندی پر ہے ناداں اشتراکیت تری
اس سے کچھ ہی پست ہوگا ایٹمی گولوں کا ڈھیر
بیٹھ کر ڈکارتا ہے جس پہ واشنگٹن کا شیر
میری چٹکی میں ہے اس کی دم ہلا دوں گا کبھی
کچھ نہیں کچھ بھی نہیں دنیا کی بربادی میں دیر

پانچواں مشیر

۱

ویتنامی جنگلوں میں جس کے ناخن رہ گئے
کیسے سمجھے جا رہا ہے اب بھی تو اس کو دلیر
کاخِ واشنگٹن سے ٹکرانے لگا سیلابِ امن
اس سے زندہ پار اتر سکتا نہیں کاغذ کا شیر

آواز

مجلس آرائی کی فرصت بھی نہیں تجھکو اجازت بھی نہیں

پانچواں مشیر

وقت کا اعلان سن کے اسطرح تو منہ نہ پھیر
مجلسِ شوریٰ کو کر برخواست اس میں کر نہ دیر

ابلیس مجلس برخواست کرنے کا اعلان کر دیتا ہے۔

متفرقات

ترتیب

۱۔ چہرہ میرے سامنے ہے (غزل) ---------- ۳۱۷
۲۔ رات جب گاؤں کی (نظم) ---------- ۳۱۸
۳۔ گوریلا ---------- ۳۱۹
۴۔ دو مراثن پاس ---------- ۳۲۱
۵۔ گم شدہ شہر ---------- ۳۲۲
۶۔ وصیت (اپنے بیٹے پارس کے نام) ---------- ۳۲۵
۷۔ نوحہ (گرو دت کی موت پر) ---------- ۳۲۸

☆☆☆

غزل

جو وہ مرے نہ رہے میں بھی کب کسی کا رہا
بچھڑ کے اُن سے سلیقہ نہ زندگی کا رہا

لبوں سے اڑ گیا جگنو کی طرح نام اس کا
سہارا اب مرے گھر میں نہ روشنی کا رہا

گزرنے کو تو ہزاروں ہی قافلے گزرے
زمیں پہ نقش قدم بس کسی کسی کا رہا

☆

نظم

رات جب گاؤں کی کھلی چھت پر
سو رہا تھا میں چاندنی اوڑھے
میرے فرقت گزیدہ پہلو میں
سو گیا چاند آ کے چپکے سے
وہ بھی پیاسا تھا میں بھی پیاسا تھا
ٹھنڈے ٹھنڈے سے اسکے ہونٹوں پر
رکھ دیے میں نے اپنے جلتے ہونٹ
اور سب اسکی چاندنی پی لی
چاند بے نور ہو کے ڈوب گیا

☆

کوریا

خونخوار فرانکو کے بیٹو
تاریخ کا رخ بدل دیا ہے
اب ہم پہ نہ فتح پا سکو گے
اسپین نہیں یہ کوریا ہے
سینوں کی خراش ہی نہ دیکھو
ماتھوں پہ بھی بل پڑے ہوئے ہیں
میڈرڈ میں گرائے تھے جو لاشے
سیول میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں
کل جن کے سیے تھے ہونٹ تم نے
وہ شعلہ زباں ہو گئے ہیں
برچھیوں پہ جنھیں اٹھایا تھا
بچے وہ جوان ہو گئے ہیں
گزرا ہے جدھر سے سرخ پرچم
اس راہ میں پھول کھل گئے ہیں

انکو نہ ہٹا سکیں گے بھونچال
جو بات پہ اپنی اڑ گئے ہیں
گاڑے تھے جو سر قدم قدم پر
دھرتی میں وہ جڑ پکڑ گئے ہیں
بہتے ہوئے اشک تھم رہے ہیں
پانی سے نکل رہی ہے دنیا
جو پاؤں جکڑ دیے تھے تم نے
اس پاؤں سے چل رہی ہے دنیا

☆

دوسرا بن باس

رام بن باس سے جب لوٹ کے گھر میں آئے
یاد جنگل بہت آیا۔ جو نگر میں آئے
رقصِ دیوانگی آنگن میں جو دیکھا ہوگا
چھ دسمبر کو سری رام نے سوچا ہوگا
اتنے دیوانے کہاں سے مرے گھر میں آئے
جگمگاتے تھے جہاں رام کے قدموں کے نشاں
پیار کی کاہکشاں لیتی تھی انگڑائی جہاں
موڑ نفرت کے اسی راہ گذر میں آئے
دھرم کیا ان کا تھا، کیا ذات تھی، یہ جانتا کون
گھر نہ جلتا تو انھیں رات میں پہچانتا کون
گھر جلانے کو مرا لوگ جو گھر میں آئے
شاکاہاری تھے میرے دوست تمھارے خنجر
تم نے بابر کی طرف پھینکے تھے سارے پتھر
ہے مرے سر کی خطا، زخم جو سر میں آئے
پاؤں سرجو میں ابھی رام نے دھوئے بھی نہ تھے
کہ نظر آئے وہاں خون کے گہرے دھبے
پاؤں دھوئے بنا سرجو کے کنارے سے اٹھے
رام یہ کہتے ہوئے اپنے دوارے سے اٹھے
راجدھانی کی فضا آئی نہیں راس مجھے
چھ دسمبر کو ملا دوسرا بن باس مجھے

☆

گمشدہ شہر

ساتھیو وقت کو مہمیز کرو کار پرویز کرو
تیشۂ نو تیز کرو اور ذرا تیز کرو
بیلچے ٹوٹتے ہیں ٹوٹنے دو زنگ تو چھوٹنے دو
گمشدہ شہر کے آثار نظر آنے لگے
کچھ شکستہ در و دیوار نظر آنے لگے
جسکے سناٹے میں شاہوں کی گرج لرزاں ہے
گونجتے گونجتے سے وہ دربار نظر آنے لگے
وہ جو محرابوں میں لکھ رکھے تھے اشعار نظر آنے لگے
''حضور شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے''

ٹوٹے پھوٹے ہوئے نکلے ہیں زمیں سے جو ظروف
کہتے ہیں قافلہ اک دن کوئی آیا تھا یہاں
اب جہاں ریت کے ٹیلے سے نظر آتے ہیں
کچھ جگر داروں نے اک شہر بسایا تھا یہاں
اس میں فرعون بھی دوچار تھے موسیٰ بھی کئی
مل کے کچھ رہتے تھے اور رہتے تھے تنہا بھی کئی

حرف حق کہتے تھے کچھ، کرتے تھے توبہ بھی کئی
اور سولی پہ چڑھائے گئے عیسیٰ بھی کئی
"جہاں حق ہے وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے"

دیوتا حسب طلب سب نے بنا رکھے تھے
اپنے طاقوں میں خدا اپنے سجا رکھے تھے
کچھ کھلے سر تھے انھیں تاج پنہا رکھے تھے
"عبادت اک گداز روح و تن کی آزمائش ہے"

جو خدا اُنکے لئے ڈھونڈ کے لاتا تھا شکار
جو خدا اُنکے لئے رکھتا تھا موسم ہموار
گڑھ دیا کرتا تھا پتھر کے نوکیلے ہتھیار
بس گیا شہر تو معمار چلے شہر سے دور
کہ کسی ملک کو درکار تھے سستے مزدور
حاکم شہر کی یہ بات ہے اتنک مشہور
جو بھلے شہری ہیں کر لیتے ہیں بکنا منظور
"تمدن ان غلاموں ہی کے فن کی آزمائش ہے"

روح ان شہروں کے انجام سے گھبراتی ہے
بھوکی مخلوق تو سو طرح بہل جاتی ہے
بھوکی سو جاتی ہے شکر اُسکا بجا لاتی ہے
ہو زمیں بھوکی تو شہروں کو نگل جاتی ہے
"ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے"

☆

۱۶/۱/اگست ۱۹۹۱ء

وصیت

(اپنے بیٹے بابا کے نام)

میرے بیٹے میری آنکھیں میرے بعد ان کو دے دینا
جنھوں نے ریت میں سر گاڑ رکھے ہیں
اور ایسے مطمئن ہیں جیسے ان کو
نہ کوئی دیکھتا ہے اور نہ کوئی دیکھ سکتا ہے
مگر یہ وقت کی جاسوس نظریں
جو پیچھا کرتی ہیں سب کا ضمیروں کے اندھیرے تک
اندھیرا نور پر رہتا ہے غالب بس سویرے تک
سویرا ہونے والا ہے

(۲)

مرے بیٹے مری آنکھیں مرے بعد اُن کو دے دینا
کہ جو اندھے سورما جو تیر اندھیرے میں چلاتے ہیں
صدا دشمن کا سینہ تاکتے خود زخم کھاتے ہیں
لگا کر جو وطن کو داؤ پر کرسی بچاتے ہیں
بھنا کر کھوٹے سکے دھرم کے جو دھن کماتے ہیں
جتا دو ان کو ایسے ٹھگ کبھی پکڑے بھی جاتے ہیں

(۳)

مرے بیٹے انھیں تھوڑی سی خودداری بھی دے دینا
جو حاکم قرض لیکے اسکو اپنی جیت کہتے ہیں
جہاں رکھتے ہیں سونا رہن خود بھی رہن رہتے ہیں
اور اسکو بھی وہ اپنی جیت کہتے ہیں
شریک جرم ہیں یہ سن کے جو خاموش رہتے ہیں
قصور اپنا یہ کیا کم ہے کہ ہم سب ان کو سہتے ہیں

(۴)

مرے بیٹے مرے بعد اُن کو میرا دل بھی دے دینا
کہ جو شر رکھتے ہیں سینے میں اپنے دل نہیں رکھتے
ہے انکی آنکھیں میں وہ بھی جو قابل نہیں رکھتے
جو چلتے ہیں انھیں رستوں پہ جو منزل نہیں رکھتے
یہ مجنوں اپنی نظروں میں کوئی محمل نہیں رکھتے
یہ اپنے پاس کچھ بھی فخر کے قابل نہیں رکھتے

ترس کھا کر جنھیں جنتا نے کرسی پہ بٹھایا ہے
وہ خود سے تو نہ اٹھیں گے انھیں تم ہی اٹھا دینا
گھٹائی ہے جنھوں نے اتنی قیمت اپنے سکّے کی
یہ ذمہ ہے تمھارا اُن کی قیمت تم گھٹا دینا
جو وہ پھیلائیں دامن یہ وصیت یاد کر لینا
انھیں ہر چیز دے دینا پر ان کو ووٹ مت دینا

☆

نوحہ

(گرودت کی موت پر)

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی
ڈرتا ہوں کہیں خشک نہ ہو جائے سمندر
راکھ اپنی کبھی آپ بہاتا نہیں کوئی
اک بار تو خود موت بھی گھبرا گئی ہوگی
یوں موت کو سینے سے لگاتا نہیں کوئی
مانا کہ اجالوں نے تمھیں داغ دیے تھے
بے رات ڈھلے شمع بجھاتا نہیں کوئی
ساقی سے گلہ تھا تمھیں میخانے سے شکوہ
اب زہر سے بھی پیاس بجھاتا نہیں کوئی
ہر صبح ہلا دیتا تھا زنجیر زمانہ
کیوں آج دِوانے کو جگاتا نہیں کوئی
ارتھی تو اٹھا لیتے ہیں سب اشک بہا کے
نازِ دلِ بیتاب اٹھاتا نہیں کوئی

☆

۱۹۶۴ء

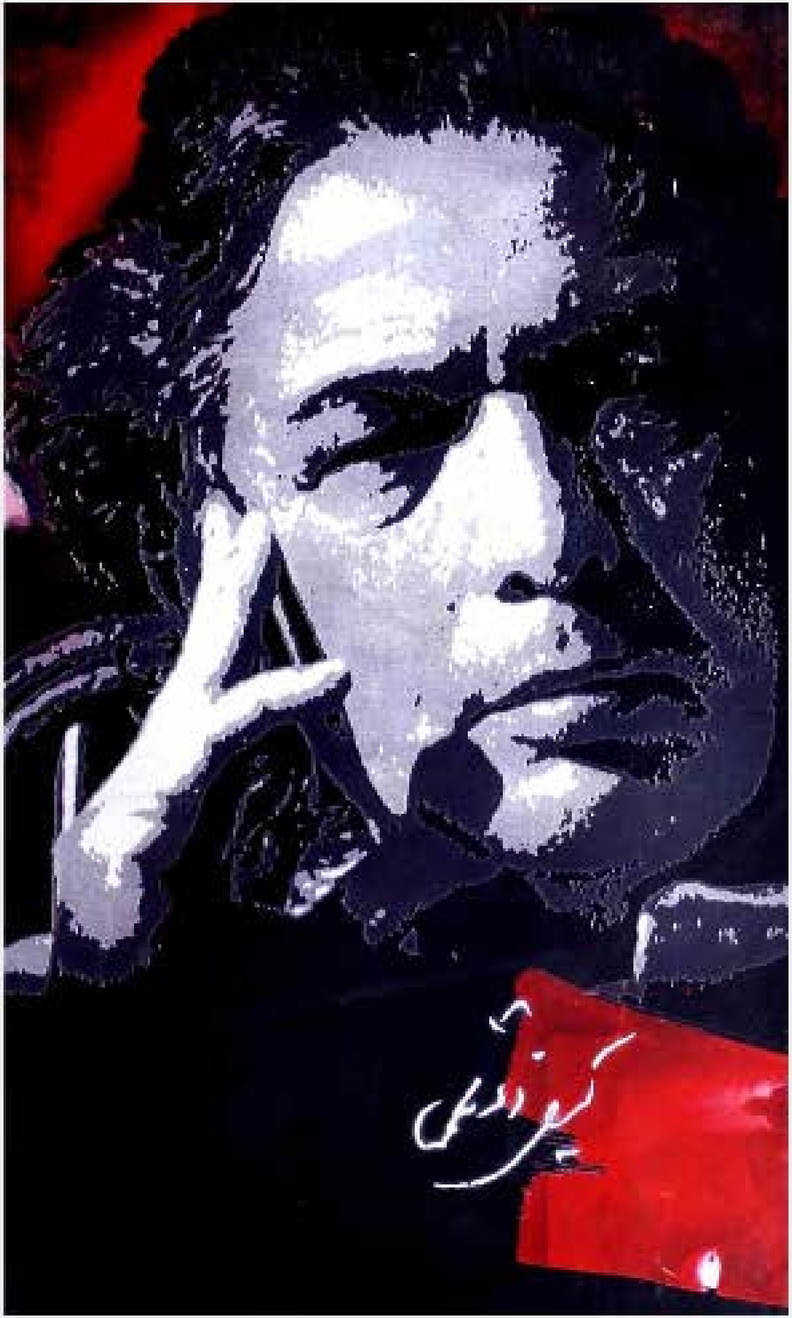

نوحہ

(گرودت کی موت پر)

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

ڈرتا ہوں کہیں خشک نہ ہو جائے سمندر
راکھ اپنی کبھی آپ بہاتا نہیں کوئی

اک بار تو خود موت بھی گھبرا گئی ہوگی
یوں موت کو سینے سے لگاتا نہیں کوئی

مانا کہ اجالوں نے تمھیں داغ دیے تھے
بے رات ڈھلے شمع بجھاتا نہیں کوئی

ساقی سے گلہ تھا تمھیں میخانے سے شکوہ
اب زہر سے بھی پیاس بجھاتا نہیں کوئی

ہر صبح ہلا دیتا تھا زنجیر زمانہ
کیوں آج دوانے کو جگاتا نہیں کوئی

ارتھی تو اٹھا لیتے ہیں سب اشک بہا کے
نازِ دلِ بیتاب اٹھاتا نہیں کوئی

☆

۱۹۶۴ء